Monthly AWAMI JAMHURIAT
عوامی جمہوریت
ماہنامہ
اگست/ستمبر
2018

☆

اشاعت کا
50واں سال

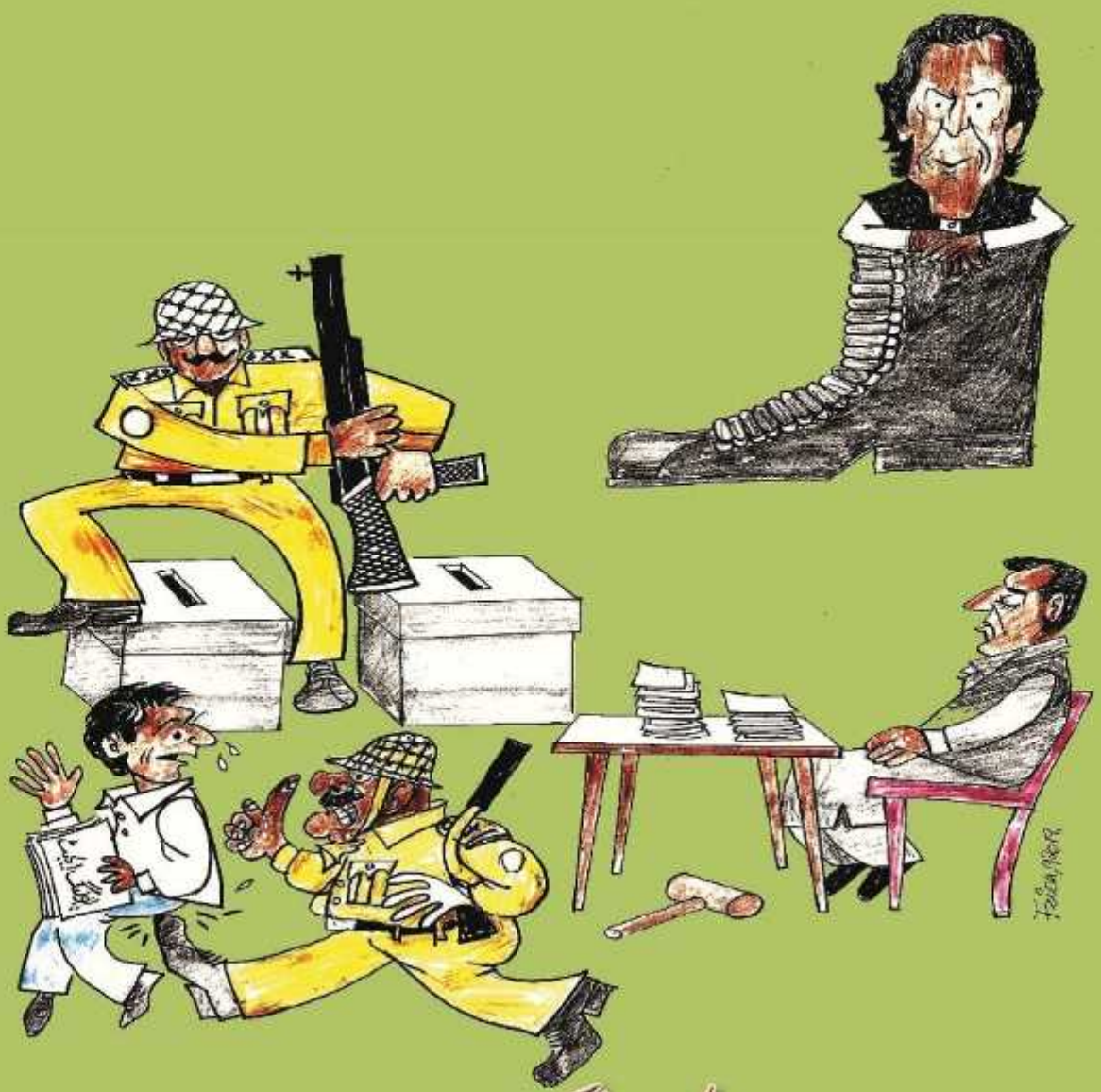

تبدیلی آ گئی ہے...

عوامی ورکرز پارٹی کے عہدادارن یوسف مستی خان، اختر حسین، شفیع شیخ کا کاٹھور سے پارٹی میں شامل ہونے والے ساتھیوں کے ساتھ ایک گروپ فوٹو

زرعی پانی کی قلت کے خلاف عوامی ورکرز پارٹی نصیر آباد کا مظاہرہ

ایکوافینا کے ملازمین کے احتجاج کے موقع پر اے ڈبلیو پی کے سینئر نائب صدر یوسف مستی خان کا مظاہرین سے اظہار یکجہتی

ماھنامہ
MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE
لاھور
عوامی جمہوریت
CPL No 279

شمارہ نمبر۔5
جلد نمبر۔14
اگست/ستمبر 2018
قیمت:30روپے

ادار یہ

2018 کے انتخابات' تبدیلی اور نیا پاکستان

ہم نے انتخابات سے قبل اپنے پچھلے تین شماروں میں تمام دائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں اور اسٹیبلشمنٹ کے کردار اور تمام ریاستی اداروں کے گٹھ جوڑ پر بات کی تھی جو پاکستان کے معاشی' سماجی اور سیاسی نظام کو جوں کا توں رکھنا چاہتی ہیں' تحریک انصاف کی انتخابات میں جیت کو باقی تمام سیاسی پارٹیوں نے بدترین دھاندلی' اسٹیبلشمنٹ کی مینجمنٹ اور الیکشن کمیشن کی نااہلی قرار دیا ہے۔ دیکھا جائے تو اس کی بڑی ذمہ داری بھی ان تمام سیاسی پارٹیوں پر عائد ہوتی ہے جو ہمیشہ یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ انتخابات فوج کی نگرانی میں کرائے جائیں اور الیکشن کمیشن کا سربراہ سپریم کورٹ کا ریٹائرڈ جج ہی ہونا چاہیے جیسے کوئی اور شہری ایماندار اور اہل نہیں ہوسکتا' سول انتظامیہ کو سیاسی اثرات سے پاک اور مضبوط کرنے کے بجائے فوج ہی کو دعوت دی جاتی ہے۔ اربوں روپے کے اضافی اخراجات کے علاوہ اس دفعہ انہوں نے ثابت کردیا کہ انتخابات اور نتائج کیسے چینج کیے جاتے ہیں۔ الیکشن کمیشن کا تمام RTS نظام فیل ہوگیا چنانچہ پولنگ اسٹیشن سے لے کر ریٹرننگ آفیسر کے دفتر تک تمام نتائج اس طرح بنائے گئے کہ چوبیس گھنٹے تک پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہورہا ہے؟ ان انتخابات کے نتائج اور اس سے قبل بھی ہونے والے انتخابات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ضروری نہیں' الیکشن کمیشن کے اراکین اور اس کا سربراہ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے جج ہی ہوں۔ دوسرے ممالک کے تجربات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ججوں کے علاوہ بھی ایماندار' قابل اور زیادہ اہل شہری اور عہدیدار ہوسکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ انتخابات میں فوج کی نگرانی والا مطالبہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجانا چاہیے۔ ہمیں سول انتظامیہ کو مضبوط اور سیاسی اثرات سے پاک رکھنا چاہیے۔ اسی سے جمہوری نظام مضبوط اور فوجی بالادستی کے خاتمے کی راہ ہموار ہوگی۔ بہرحال انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کے باوجود لوگوں نے تحریک انصاف کو اکثریتی ووٹ دیا اور پارلیمنٹ میں اقلیتی نمائندگی رکھنے والی پارٹیوں کا یہ قدم بھی مثبت ہے کہ انہوں نے پارلیمنٹ میں بیٹھنے کا فیصلہ کرلیا' اور اس وقت پارلیمنٹ سے باہر بڑے پیمانے پر احتجاج اور تحریک چلانے کے بجائے جس کا نتیجہ پھر آئین کی معطّلی ہوسکتا تھا' آئینی نظام جاری رکھنے کو ترجیح دی۔ مگر اس کے بعد حزب اختلاف کا متحد نہ ہونا بھی مختلف مفادات کے تحت اسٹیبلشمنٹ کی مینجمنٹ ہی لگتی ہے جس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ تحریک انصاف اور جو Setup قائم کیا گیا ہے اس کو کھلا موقع دیا جائے ورنہ حزب اختلاف کے یکجا و متحد ہونے سے چیئرمین سینیٹ اور صدر کے انتخابات پر اثر پڑنے کے علاوہ حکومت کے لیے اپنی پالیسیاں چلانے میں کافی مشکلات پیش آسکتی تھیں۔ اس سلسلے میں حکومتی تشکیل سے پہلے اور بعد میں وزیراعظم کی بار بار فوجی ہیڈکوارٹرز اور ان کے اہم اداروں میں بریفنگ' حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کے مکمل طور پر یکجا ہونے ہی کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ یہ واضح ہوتا ہے کہ حکومت کی تمام پالیسیاں یعنی خارجی' دفاعی ہوں یا معاشی و اندرونی اسٹیبلشمنٹ کی پالیسی کے تحت ہیں اور ان ہی کا فیصلہ کن کردار ہے۔ یہی ان انتخابات کا حاصل ہے۔

ایڈیٹر
اختر حسین
مجلس ادارت
عابد حسن منٹو
مسلم شمیم' صباالدین صبا' توقیر چغتائی
اثر امام' عابد شکیل فاروقی
مینجنگ ایڈیٹر
اے آر عارف
سرکولیشن منیجر
اشتیاق اعظمی

لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ لاہور' پاکستان

ادار یہ 1
2018 کے انتخابات...... ڈاکٹر توصیف احمد خان 4
بجٹ کا خسارہ...... نجم الحسن عطا 7
ادب' ادیب اور جمہوری شعور مسلم شمیم 9
کارل مارکس کی 200ویں سالگرہ صباالدین صبا 12
انتخابی سیاست اور بایاں بازو اثر امام 16
تعلیمی نصاب۔ نیا تنازعہ ڈاکٹر ریاض شیخ 18
رسالہ عوامی جمہوریت شاہ محمد مری 20
جمہوریت اور انتخابات کا کھلواڑ زبیر الرحمٰن 23
بانی مزدور تحریک...... منظور احمد رضی 25
ایک نظر...... عابد شکیل فاروقی 27
سیاسیی پارٹیوں... گلزار چنا 31

فون:042-37353309-37357091
فیکس:94-42-36361531
کراچی آفس:201-204 پینوراما سینٹر نمبر 1 فاطمہ جناح روڈ' صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

تبدیلی اور نیا پاکستان

جناب عمران خان صاحب نے اپنی سیاست اور انتخابات میں تبدیلی اور نئے پاکستان کا نعرہ لگایا جہاں تک نئے پاکستان کا تعلق ہے تو یہ تیسرا پاکستان ہوگا پہلا تو ۱۹۴۷ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے بنایا جن کی جدوجہد ہندوستان کے اندر ریاستوں یا وفاقی اکائیوں کی اپنے معاشی وسائل پر دسترس اور سیاسی خود مختاری کی تھی تاکہ وہ معاشی' سماجی' سیاسی طور پر ترقی کرسکیں' سیاسی طور پر ایسے پاکستان کا تصور تھا جس کا اظہار انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو آئین ساز اسمبلی کے صدر منتخب ہونے پر کیا تھا یعنی ریاست کی مذہبی کاروبار سے مکمل علیحدگی اور حقیقی جمہوریت جس میں تمام شہری آئین کی نظر میں برابر ہوں۔ مگر ان کی وفات کے بعد حکمران طبقات نے ان بنیادی اصولوں کے برخلاف کام کرتے ہوئے جو حشر برپا کیا اس کا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کی آزادی پر نکلا۔ دوسرا پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد ۱۹۷۲ء میں قائم کیا مگر ۱۹۷۲ء سے ۲۰۱۸ء تک ہم نے ۴۵ سالوں میں ۲۰ سال براہ راست فوجی حکمرانی میں گزارے اور نام نہاد جمہوری حکومتیں بھی فوجی بالادستی اور ماتحتی میں رہیں۔ ملک کی تمام فوجی اکائیاں آج بھی اپنے معاشی وسائل پر اپنا حق مانگتی ہیں' قبائلی اور جاگیری باقیات کی وجہ سے بڑے بڑے زمینداروں' قبائلی سرداروں' وڈیروں کا فوجی گٹھ جوڑ کے ساتھ سیاست میں بالادستی قائم ہے کروڑوں عوام تعلیم روزگار' صحت' علاج معالجے کا حق تو کجا نانِ شبینہ کو ترس رہے ہیں' قومی آمدنی کا کم از کم پچاس فیصد دفاع پر خرچ ہوتا ہے۔ خفیہ بجٹ الگ ہے' ملک کا ۳۵ فیصد سرمایہ دفاعی اداروں کے تحت فاؤنڈیشنوں اور کارپوریشنوں کا ہے ان کی آمدنی کل آمدنی کا ۱۳ فیصد ہے۔ سرمایہ دارانہ ترقی آج بھی سامراجی ممالک کے اداروں ورلڈ بنک' آئی ایم ایف' وغیرہ کی نیولبرل پالیسیوں کے ماتحت ہے کرپشن جس کا لازمی جز ہے اندرونی و بیرونی قرضے جی ڈی پی کا 72 فیصد ہیں جن کا کل حجم 245 کھرب روپے ہے جن میں بیرونی قرضے 92.6 ارب ڈالر ہیں۔ تمام حکمران ملک میں بدترین کرپشن اور لوٹ مار میں شریک ہیں اور کرپشن کا زیادہ روپیہ بیرون ملک منتقل ہوگیا ہے۔ ملک میں فرقہ واریت' مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی عروج پر ہے۔ تمام پڑوسی ملکوں سے تعلقات انتہائی کشیدہ ہیں اور بین الاقوامی طور پر خارجہ تعلقات کے حوالے سے پاکستان تنہائی کا شکار ہے اس طرح دوسرے پاکستان کو سیاہ دائرے میں چلے جانے سے پہلے گرے ایریا میں داخل کردیا گیا ہے۔ ان حالات میں عمران خان نے نئے یا تیسرے پاکستان اور تبدیلی کا نعرہ لگایا اور عوام نے اس مایوسی کے عالم میں شاید اسی لیے ان سے توقعات وابستہ کرلیں اور ووٹ دیا لیکن آئیں دیکھیں کیا یہ ان سے ممکن ہے؟

کسی بھی سیاسی پارٹی سے سماج میں تبدیلی کی توقع اس کے منشور' انتخابی پروگرام' دستور اور پارٹی کی قیادت کے کردار اور مسلسل جدوجہد سے ہوتا ہے نہ کہ محض لفاظی اور نعرے بازی سے۔ تحریک انصاف کے منشور میں نہ تو ملک سے جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کے خاتمے کا ذکر ہے نہ ہی انہوں نے اپنی انتخابی مہم میں کبھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی قیادت میں جہانگیر ترین اور شاہ محمود قریشی جیسے بڑے بڑے زمیندار' پیر اور جاگیری باقیات کے محافظ بیٹھے ہیں۔ معیشت کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ جاگیری و قبائلی باقیات کے خاتمے اور بنیادی زرعی اصلاحات کے ذریعے غیر حاضر زمینداری کے خاتمے اور زمین کی کسانوں' ہاریوں اور کھیت مزدوروں میں تقسیم کیے بغیر کس طرح دیہی معیشت ترقی اور ۶۰ فیصدی آبادی کی معاشی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔ ان کے منشور میں ترقی کا وہی سرمایہ دارانہ راستہ بتایا ہے جس کے تحت ملک آج تک قرض کی غلامی میں ہے یعنی سامراج کی نیولبرل پالیسیوں کے تحت مزید پرائیوٹائزیشن' مزید بیروزگاریاں' مزید مہنگائی۔ اچھی حکمرانی کی لفاظی سے ملک کی معیشت بہتر نہیں ہوسکتی۔ اچھی حکمرانی اور تبدیلی تو حکومت کی تشکیل کے ساتھ ہی اس سے نظر آ گئی ہے کہ وزیراعظم عمران خان کی کابینہ میں تیرہ وزیر و مشیر جنرل پرویز مشرف کی کابینہ کے ہیں جنہوں نے دس سال کی حکمرانی میں ملک پر امریکی اور مغربی سامراجی ملکوں کی بالادستی کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ مزید غلام بنایا' آئین کو توڑا' عدلیہ کو اور جمہوری اداروں کو تباہ کیا' کرپشن و لوٹ مار کو عروج پر پہنچایا اور آج خود دوبئی اور لندن میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے اور غداری کے مقدمے میں ان کا دفاع کرنے والا وکیل عمران خان کا وزیرِ قانون ہے۔

قانون کے تحت برابری

اس تیسرے نئے پاکستان کے وزیراعظم نے اپنے پہلے خطاب میں کہا ہے کہ ''ملک میں قانون کے تحت سب برابر ہیں۔'' پہلے ان کی خدمت میں یہ عرض کریں کہ جس ملک کا آئین جو بنیادی دستاویز ہے وہی شہریوں کو برابری نہیں دیتا تو باقی قوانین میں برابری کیا ہوگی۔ پہلے تو آئینی اصلاحات کے ذریعے اس کے اندر ان تمام شقوں کا خاتمہ ضروری ہے جو شہریوں کے درمیان مذہب' عقیدے' جنس اور رتبے یا معاشی و سماجی نابرابری کی بنیاد بنتی ہیں دوسرا پہلے ان تمام قوانین کے خاتمے کی ضرورت ہے جو مذہبی و جنسی بنیادوں پر تفریق پیدا کرتے ہیں تیسرا ان کی تبدیلی و برابری کے لیے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کبھی بھی نابرابر لوگوں کے درمیان برابری قائم نہیں ہوسکتی۔ایک طرف سرمایہ دار ہیں' جاگیر داری ہیں' بالادست اور غاصب ہیں اور دوسری طرف خلق خدا جو ہر طرح کی یعنی معاشی' سماجی سیاسی محرومیوں کا شاکر یعنی آقار' آقار ہے اور غلام غلام اور پھر کہیں کہ ملکی قانون کے تحت سب برابر ہیں۔ ایسے قوانین کی تشکیل کی ضرورت ہے جن کے تحت معاشی و سماجی نابرابری ختم ہو اس کے علاوہ تو محض منافقت ہوگی جو سرمایہ دارانہ نظام میں چلی آرہی ہے اور جیسے عمران خان صاحب نے اپنی معاشی مشاورتی کمیٹی میں ایک غیر مسلم معیشت دان عاطف میاں کو شامل کرلیا اور پھر مذہبی فرقہ واری لابی کے دباؤ اور خوف کے تحت اس بنیاد پر نکال دیا کہ وہ احمدی ہیں۔ کیا کسی غیر مسلم کو ملک کی معاشی و سیاسی ترقی اور انتظامی شعبے میں حصہ لینے کا حق نہیں ہے کون سا قانون اس کے مانع آتا ہے مسئلہ تو اس ذہن کو بدلنے کا ہے جس میں عصبیت' منافقت' نابرابری کوٹ کوٹ کر بھری ہے حکمرانوں کی طرف سے سادگی اختیار کرنا' غیر ضروری پروٹوکول کا خاتمہ اور سرکاری شاہانہ دفاتر و عمارتوں کے خاتمے کا اعلان اچھی بات ہے لیکن تحریک انصاف جیسی پارٹی و قیادت کے لیے ایک تو مشکل ہے دوسرا ان کے خاتمے سے بھی ملک کی معاشی حالت جس کا وہ شکار ہے تبدیل نہیں ہوسکتی ہمیں اسلام آباد میں وزیراعظم ہاؤس کو اسٹیٹ آف دی آرٹ یونیورسٹی بنانے کی ضرورت نہیں جس میں وہی اوپری طبقے کے لوگ جو امریکہ اور برطانیہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں' جائیں گے' ہمیں تو لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام کے خاتمے کے ساتھ پہلے ایک تعلیمی نظام کے تحت پرائمری اور سیکنڈری اسکول ایک ایک گاؤں ایک ایک محلے میں قائم کرنے کی ضرورت یہ ہمیں لارڈ میکالے کے مائنڈ سیٹ سے نکلنے کی ضرورت ہے اور پورے ملک میں برابر ترقی اور روزگار کے مواقع مہیا کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ معاشی و سماجی نابرابری کے خاتمے کے ساتھ ہی قانون کے تحت برابری قائم ہوگی۔

مگر معاشی و سماجی نابرابری کا خاتمہ تو ایک ایسی سیاسی پارٹی ہی کرسکتی ہے جس کے پروگرام کی بنیاد طبقاتی نظام کے خاتمے اور غیر طبقاتی سماج کے قیام پر ہو جس میں ہر شخص سے اس کے علم و ہنر کے مطابق کام لیا جائے اور ہر کسی کو جنس' عقیدے یا مذہب کی تفریق کے بغیر برابر معاوضہ دیا جائے جس کی کمٹمنٹ بڑی زمینداریوں کے خاتمے اور زرعی زمینات کی کسانوں' ہاریوں' کھیت مزدوروں میں جنسی تفریق کے بغیر مفت تقسیم سے ہو۔ جو تعلیم' روزگار' صحت اور سر چھپانے کی چھت کو ہر شہری کا بنیادی آئینی حق سمجھے۔

اس کثیر الاقومی ملک میں بسنے والے تمام قوموں کی برابری اور ان کے تمام معاشی وسائل پر ان کا حق تسلیم کرے سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کرتے ہوئے اشتراکیت پذیری کی راہ اختیار کرے اور یہ کام ملک میں بائیں بازو کی سیاسی پارٹیاں ہی کرسکتی ہیں جن کو متحد ہونے اور مسلسل جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملک میں برابری کے لیے متبادل قوت بن سکیں۔☆☆

2018ء کے انتخابات اور پولیٹیکل انجنیئرنگ

ڈاکٹر توصیف احمد خان

انتخابات 2018ء کے نتائج سے پھر ثابت ہوگیا کہ سویلین کی تمام اداروں پر بالادستی نہیں ہے۔ پھر ڈیپ اسٹیٹ نے پورے نظام کو کنٹرول کرلیا اور پولیٹکل انجنیئرنگ کے ذریعے انتخابی نتائج کو اپنے مقاصد کے لیے تبدیل کردیا گیا۔ مگر 25 جولائی کو ہونے والی پولیٹیکل انجنیئرنگ کو ثابت کرنا ملین ڈالر کا سوال ہے۔ 1973ء کے آئین کے تحت اس سال انتخابات طے تھے۔ مسلم لیگ ن کی وفاقی حکومت، پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف کی صوبائی حکومتوں نے واضح کیا تھا کہ وہ آئینی مدت پوری کرنے کی خواہاں ہیں، یوں انتخابات کے لیے 25 جولائی کی تاریخ طے ہوگئی۔ عسکری اسٹیبلشمنٹ نے گذشتہ سال سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف کی پاناما اسکینڈل کو سپریم کورٹ کے حوالے کرنے کی حکمت عملی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس سال سپریم کورٹ نے میاں نواز شریف کو نااہل قرار دیا۔ پھر نیب نے مسلم لیگ ن کے رہنماؤں کو چن چن کر نشانہ بنانا شروع کردیا۔ میاں نواز شریف اور شہباز شریف کے علاوہ بیشتر وزراء کے خلاف نیب نے تحقیقات شروع کردیں۔ پھر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ثاقب نثار نے ازخود نوٹس کے ہتھیار کے ذریعے وفاقی وزراء کو سپریم کورٹ میں طلب کرنا شروع کیا۔ وزارت اطلاعات، داخلہ، ریلوے، خزانہ اور خودمختار اداروں کے معاملات ازخود نوٹس کے ذریعے سپریم کورٹ میں زیر بحث آنے لگے۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ صرف سپریم کورٹ کے سامنے مسلم لیگ ن کے وزراء اور اراکین کے احتساب کا معاملہ ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی مختلف معاملات پر تحقیقات تیز کردی گئیں۔ گذشتہ دسمبر میں انتخابی اصلاحات کے مسودہ کی پارلیمنٹ سے منظوری کے بعد عسکری اسٹیبلشمنٹ کے لاڈلے شیخ رشید نے ختم نبوت کا معاملہ اٹھایا۔ پھر اچانک ہزاروں لوگ راولپنڈی اور اسلام آباد کو ملانے والے علاقے میں جمع ہوئے، یوں کئی دنوں تک دھرنا ہوا۔ فوج کے خفیہ عسکری ادارے نے دھرنا ختم کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک فوجی افسر نے دھرنے کے خاتمے پر واپس جانے والے لوگوں میں لفافے تقسیم کیے اور مولانا خادم رضوی کی قیادت میں ایک اور مذہبی تنظیم تحریک لبیک وجود میں آئی۔ تحریک لبیک نے سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قتل میں پھانسی کی سزا پانے والے ایلیٹ فورس کے سپاہی ممتاز قادری کو اپنا ہیرو قرار دیا۔ اس پورے معاملہ کی تحقیقات کے لیے وفاقی کابینہ نے مسلم لیگی رہنما راجہ ظفر الحق کی قیادت میں ایک کمیٹی قائم کی مگر عباسی حکومت نے یہ رپورٹ جاری نہیں کی۔ اسلام آباد ہائی کورٹ کے جج جسٹس شوکت عزیز صدیقی کے حکم پر یہ رپورٹ شائع ہوئی تو پتہ چلا کہ متنازعہ قانون کا مسودہ تیار کرنے والوں میں تحریک انصاف کے رہنما شفقت محمود بھی شامل تھے۔ مگر تحریک لبیک نے پورے پنجاب میں مسلم لیگ کے ہی خلاف مہم چلائی۔ تحریک لبیک نے پنجاب میں 12 سے زائد نشستوں پر مسلم لیگ ن کی فتح کو روکا۔ سینٹ کے درمیانی مدت کے انتخابات سے قبل بلوچستان کے وزیر اعلیٰ ثناء اللہ زہری کے خلاف اچانک بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت میں مسلم لیگ ن اور مسلم لیگ ق کے اراکین اسمبلی شامل تھے۔ جمعیت علماء اسلام بلوچستان، نیشنل پارٹی مینگل گروپ نے زہری کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی حمایت کی۔ پیپلز پارٹی کے چیئرپرسن آصف علی زرداری نے بلوچستان کی حکومت کی تبدیلی میں خصوصی دلچسپی لی۔ ان کے قریبی مشیر ڈاکٹر عبدالقیوم سومرو نے کوئٹہ میں کئی دن گزارے۔ وزیر اعلیٰ ثناء اللہ زہری جب استعفیٰ دینے پر تیار نہ ہوئے تو ان کے اسٹاف افسر کو کروڑوں روپے کی بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا تو آخرکار زہری مستعفی ہوگئے۔ اگرچہ گذشتہ اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی بلوچستان میں کوئی نشست نہیں تھی مگر زرداری نے بلوچستان کے اراکین اسمبلی کے اعزاز میں ضیافت دی۔ بعد میں ماہرین نے بلوچستان میں تبدیلی کو پولیٹیکل انجنیئرنگ کا پہلا مرحلہ قرار دیا۔ پھر بلوچستان میں اچانک ایک نئی جماعت بلوچستان عوامی پارٹی قائم ہوئی۔ بلوچستان حکومت کے بیشتر ارکان اس نئی جماعت میں شامل ہوگئے۔ پھر سینٹ کے درمیانی مدت کے انتخابات کے بعد سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف نے پیشکش کی کہ اگر پیپلز پارٹی اپنے بانی رکن رضا ربانی کو سینٹ کے

چیئرمین کے لیے نامزد کرتی ہے تو مسلم لیگ ن ان کی حمایت کرے گی مگر آصف زرداری نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور بلوچستان سے منتخب ہونے والے آزاد رکن صادق سنجرانی کی حمایت کی اور ڈپٹی چیئرمین کے لیے اپنے رکن سلیم مانڈوی والا کو نامزد کیا۔ تحریک انصاف کے صدر عمران خان اچانک صادق سنجرانی اور سلیم مانڈوی والا کی حمایت پر تیار ہو گئے۔ مسلم لیگ ن کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں شریک بعض اراکین نے شکایت کی کہ نامعلوم افراد ٹیلیفون پر انہیں مسلم لیگ ن کے بجائے دیگر امیدواروں کو ووٹ دینے اور ہدایت پر عملدرآمد نہ کرنے پر خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ سینٹ کے چیئرمین کے انتخاب میں پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف بلوچستان کے اراکین کے علاوہ ایم کیو ایم نے بھی صادق سنجرانی کی حمایت کی جس کے نتیجے میں صادق سنجرانی کامیاب ہوئے۔ پولیٹیکل انجینئرنگ کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا۔ پھر جنوبی پنجاب کے مسلم لیگ ن کے رہنماؤں نے اچانک سرائیکی صوبہ کے قیام کا نعرہ لگایا۔ معمر بلوچ سردار بلخ شیر مزاری، خسرو بختیار اور کئی رہنما مسلم لیگ ن سے علیحدہ ہو کر سرائیکی صوبہ محاذ میں جمع ہو گئے۔ بعد میں یہ لوگ تحریک انصاف میں شامل ہوئے۔ پھر بعض صحافیوں نے لکھا کہ جنوبی پنجاب میں ایگری کلچر کا محکمہ اچانک متحرک ہوا۔ مسلم لیگ ن کے اراکین پر اچانک دباؤ پڑنے لگا۔ یوں 60 کے قریب اراکین مسلم لیگ ن سے علیحدہ ہو گئے۔ ان میں سے کچھ کو تحریک انصاف نے آئندہ انتخاب میں ٹکٹ دیا۔ سکندر بوسن کا تعلق ملتان سے ہے۔ وہ بھی مسلم لیگ چھوڑ کر تحریک انصاف میں شامل ہوئے۔ انہیں ٹکٹ بھی ملا مگر پرانے کارکنوں کے احتجاج پر ٹکٹ واپس ہوا۔ اسی طرح کئی اراکین نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ جنوبی پنجاب کی سیاست کا تجزیہ کرنے والے ایک صحافی نے لکھا کہ جنوبی پنجاب سے نامعلوم قوتوں کے دباؤ پر بیشتر الیکٹیبل مسلم لیگ ن چھوڑ گئے۔ ملتان کے مسلم لیگ ن کے رہنما نے ٹی وی چینلز پر الزام لگایا کہ ملتان آئی ایس آئی کے اہلکاروں نے وفاداری تبدیل کرنے کے لیے اس پر تشدد کیا۔ اس کے گودام پر چھاپہ مارا مگر دوسرے ہی دن اس امیدوار نے صحافیوں کے سامنے اپنا الزام واپس لیا اور وضاحت کی کہ محکمہ ایگری کلچر والوں نے اس پر حملہ کیا تھا، اس نے غلط فہمی کی بناء پر ایجنسی کا نام لیا تھا۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ میجر جنرل غفور نے ایک پریس کانفرنس میں اس واقعے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مسلم لیگی رہنما کا محکمہ ایگری کلچر سے تنازعہ تھا اور انٹیلی جنس بیورو اس رہنما کے خلاف تحقیقات کر رہا تھا۔ پھر انتخابات سے قبل احتساب عدالت نے میاں نواز شریف، ان کی صاحبزادی مریم نواز اور داماد کیپٹن صفدر کو قید اور جرمانہ کی سزا دی۔ میاں نواز شریف گرفتاری دینے کے لیے لندن سے لاہور آئے تو لاہور کو کنٹینر لگا کر بند کر دیا گیا۔ پنجاب پولیس نے کئی سو لوگوں کو گرفتار کیا۔ پولیس نے ہزاروں مسلم لیگی کارکنوں کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا شدید استعمال کیا۔ انتخابات سے 3 دن قبل راولپنڈی کی انسداد منشیات کی خصوصی عدالت نے مسلم لیگ ن کے امیدوار حنیف عباسی کو عمر قید کی سزا دی۔ انہیں دوپہر 12:00 بجے عدالت بلایا گیا اور معزز جج صاحب نے رات 11:00 بجے فیصلہ سنایا۔

1973ء کے آئین میں کی گئی 18 ویں ترمیم کے تحت وزیراعظم شاہد خاقان عباسی کی حکومت اپنی آئینی مدت مکمل کرنے پر رخصت ہوئی۔ وزیراعظم خاقان عباسی اور قائد حزب اختلاف خورشید شاہ کے اتفاق رائے سے جسٹس ریٹائرڈ ناصر الملک قائم مقام وزیراعظم مقرر ہوئے۔ پنجاب میں وزیراعلیٰ شہباز شریف اور پنجاب اسمبلی میں قائد حزب اختلاف میاں محمود الرشید کے درمیان اتفاق نہ ہونے کی بناء پر الیکشن کمیشن نے تحریک انصاف کے نامزد امیدوار ڈاکٹر حسن عسکری کو قائم مقام وزیراعلیٰ نامزد کیا۔ ڈاکٹر حسن عسکری مسلم لیگ ن کی پالیسیوں کے شدید مخالف رہے ہیں۔ ان کے آرٹیکلز اور تبصرے اس بناء پر شہرت رکھتے ہیں، یوں مسلم لیگ ن نے ڈاکٹر عسکری پر عدم اعتماد کا اظہار کیا مگر ڈاکٹر عسکری نے اس اعتراض کو مسترد کیا۔ اسی طرح وفاقی کابینہ میں سابق پولیس افسر اعظم خان کو وزیر داخلہ بنایا گیا۔ اعظم خان تحریک انصاف سے قربت کی بناء پر شہرت رکھتے ہیں۔ آئین میں کی گئی 18 ویں ترمیم کے تحت الیکشن کمیشن مکمل خودمختار ہے۔ کمیشن نے عبوری حکومتوں کے قیام سے نئے ترقی کے منصوبوں کے اعلان اور ان کے افتتاح، تقرریوں اور تبادلوں پر پابندی لگا دی۔ عبوری حکومتوں نے الیکشن کمیشن کی اجازت سے تقرریوں اور تبادلوں کا کارنامہ سرانجام دیا۔ پہلی دفعہ پورے ملک کی وفاق اور صوبوں کی بیوروکریسی تبدیل کی گئی۔ تمام وفاقی وزارتوں کے سیکریٹری تبدیل ہوئے۔ وفاقی خفیہ تحقیقاتی ایجنسی انٹیلی جنس بیورو (I.B) کے سربراہ بھی تبدیل ہوئے۔ صوبوں میں سیکریٹری، کمشنر، ڈپٹی کمشنر حتیٰ

کہ اسسٹنٹ کمشنر کی سطح کے افسران تبدیل ہوئے۔ اسی طرح چاروں صوبوں کے آئی جی سمیت تھانے کے ایس ایچ او سمیت تمام افسران کے تبادلے کیے گئے۔ الیکشن کمیشن نے ضابطہ اخلاق کے لیے سیاسی جماعتوں سے مشاورت کی۔ سیاسی جماعتوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ فوج کو صرف پولیس کی مدد کے لیے بلایا جارہا ہے مگر چیف الیکشن کمشنر نے جب ضابطہ اخلاق کا اعلان کیا تو واضح ہوا کہ انتخابی عمل میں مسلح افواج کو کلیدی کردار دیا گیا۔ مسلح فوج نے بیلٹ پیپرز کی چھپائی سے لے کر انہیں متعلقہ مقامات تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیا۔ پھر پولنگ اسٹیشن کی سیکیورٹی فوج اور رینجرز کے دستوں کے حوالے کی گئی۔ فوجی جوانوں نے عملاً پولنگ اسٹیشن کی حفاظت سے لے کر پولنگ اسٹاف کی نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔ ملک کے کچھ علاقوں میں فوجی افسروں نے پولنگ اسٹیشن کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی تو یہ شکایات موصول ہوئیں کہ 24 جولائی سے پریزائیڈنگ اور پولنگ افسروں کی آمدورفت کو محدود کیا گیا۔ بعض پولنگ اسٹیشنوں پر پولنگ اسٹاف کو کھانا لانے اور موبائل ٹیلی فون تک رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ الیکشن کمیشن کے ضابطہ اخلاق میں پولنگ اسٹیشن کی ساری ذمہ داری پریزائیڈنگ آفیسر کے سپرد کی گئی مگر ملک بھر سے آنے والی اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عملی طور پر ایسا نہیں ہوا۔ اس ضابطہ اخلاق کے تحت پولنگ ایجنٹ اور صحافیوں پر پولنگ اسٹیشن پر موبائل فون لے جانے پر پابندی عائد کردی گئی جس سے بعض شکوک وشبہات کو تقویت ملی۔ کراچی میں پولنگ کے عملے کی یہ شکایت عام تھی کہ الیکشن کمیشن نے پولنگ میں استعمال ہونے والا سامان کم اور ناقص فراہم کیا۔ پھر بعض ایسے نجی اسکولوں کو پولنگ اسٹیشن بنایا گیا جو چند کمروں پر مشتمل عمارت پر محیط تھے جن کی بناء پر پولنگ کے عملے کی مشکلات بڑھیں۔ ووٹ ڈالنے کی رفتار سست رہی اور بہت سے لوگ طویل قطار کی وجہ سے اپنا حق رائے دہی استعمال نہ کرسکے۔ چھوٹے کمرے پر مشتمل پولنگ بوتھ کی وجہ سے تمام امیدواروں کے پولنگ ایجنٹ اپنے فرائض انجام نہ دے سکے۔ کراچی میں مجموعی طور پر ووٹنگ کی شرح کم رہی۔ ایم کیو ایم کے قائد کی اپیل پر ایم کیو ایم کے ووٹروں کی بڑی تعداد نے ووٹ کا حق استعمال نہیں کیا جس کا فائدہ تحریک انصاف اور تحریک لبیک پاکستان کو ہوا۔ غیر ملکی مبصرین کو بلوچستان جانے کی اجازت نہیں ملی مگر قلات اور اطراف کے علاقوں کے صحافیوں کا کہنا ہے کہ کم تعداد میں ووٹ ڈالے گئے مگر نتائج میں ووٹوں کی بڑھی ہوئی شرح کا ذکر ہوا۔ پھر نتائج کا اعلان 24 گھنٹے بعد ہوا۔ پھر ملک کے بیشتر علاقوں میں خاص طور پر سنٹرل پنجاب میں گنتی سے پہلے امیدواروں کے کاؤنٹنگ ایجنٹوں کو پولنگ اسٹیشنوں سے باہر نکال دیا گیا۔ انہیں فارم 45 نہیں دیئے گئے۔ بعض کو سادہ کاغذ پر پریزائیڈنگ افسروں کی مہر لگا کر نتائج دے دیئے گئے۔ پھر الیکشن کمیشن نے اعلان کیا تھا کہ پریزائیڈنگ افسر کے لیے نتیجہ ریٹرننگ افسر تک منتقل کرنے کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا جدید نظام (R.T.S) قائم کیا گیا ہے۔ پریزائیڈنگ افسر فارم 45 پر کر کے سینئر پریزائیڈنگ افسر اور تمام کاؤنٹنگ ایجنٹوں اور مبصرین سے دستخط کرا کے اپنے اسمارٹ فون کے ذریعے اس فارم کی تصویر ریٹرننگ افسر کو بھیج دے گا۔ ریٹرننگ افسر تمام پولنگ اسٹیشنوں سے ملنے والے نتائج کو مرتب کر کے الیکشن کمیشن کو آر ٹی ایس کے ذریعے فراہم کرے گا مگر نامعلوم وجوہات کی بناء پر الیکشن کمیشن کا یہ نظام معطل ہوگیا جس کی بناء پر نتائج میں 24 سے 36 گھنٹوں تک کی تاخیر ہوئی۔ تاریخ میں پہلی دفعہ نتائج مرتب کرنے میں بے پناہ غلطیاں ہوئیں جس کی وجہ سے 30 جولائی تک ری کاؤنٹنگ کا عمل جاری رہا۔ پھر اس دفعہ سب سے زیادہ حیرت انگیز صورتحال مسترد شدہ ووٹوں کے حوالے سے سامنے آئی۔ روزنامہ ڈان نے ایک رپورٹ میں لکھا کہ پورے ملک میں کل ووٹوں کی تعداد 54,319,922 ہے اور اس میں سے 1,663,039 ووٹ مسترد ہوئے۔ بعض حلقوں میں 12 ہزار تک ووٹ مسترد ہوئے۔ ایک دلچسپ صورتحال یہ ہوئی کہ جیتنے والا امیدوار چند سو ووٹوں کی برتری سے کامیاب ہوا مگر اس حلقہ میں مسترد شدہ ووٹوں کی تعداد 10 ہزار سے زیادہ رہی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا کہ قومی اسمبلی کے 30 کے قریب حلقوں میں امیدوار کی برتری کے ووٹوں کے مقابلے میں مسترد شدہ ووٹوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بعض امیدواروں نے الزام لگایا کہ 25 تاریخ کی رات کسی وقت ان کے بیلٹ پیپرز پر ٹھپے لگا کر مسترد شدہ ووٹوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ ڈیپ اسٹیٹ اپنی مرضی سے نتائج حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کے باوجود تحریک انصاف قطعی اکثریت حاصل نہ کرسکی۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن قومی اسمبلی میں ایک مضبوط حزب اختلاف کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئیں۔

☆☆☆

بجٹ کا خسارہ
اور پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتیں

نجم الحسن عطا

بجٹ کا خسارہ دائمی ہوگیا ہے انکم ٹیکس اور اس نظام کی خرابی بدعنوانی اور اشرافیہ کی مفاد پرستی نے لاکھوں افراد سے براہ راست ٹیکس وصول نہ کر کے ملکی معیشت کو تباہ کر دیا ہے اب خود انحصاری کے لیے روایتی سیاست کی بجائے سینٹ کرافٹ کی گہری مہارتیں درکار ہیں عوام کی محنت اور ان کی تربیت کو سی پیک کے لیے ''اسکل فل'' پاکستانیوں کو تکنیکی کاموں پر لگایا جائے تا کہ سی پیک سے استفادہ کیا جاسکے ورنہ نقصان ایک اور عذاب کو دعوت دے گا خود انحصاری تو درکنار بجٹ کے خسارے کو ختم کرنے کے لیے غیر ملکی درآمدات پر منحصر: نعتوں کی انفراسٹرکچر کے تحفظ سے بھی معذور ہے قوم کی تخلیقی اور پیداواری نظام سے لاتعلقی بجٹ کے موجودہ اعداد و شمار کی حیثیت قرضوں اور سود کی ادائیگی سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتی ۔ بحران کی اس نازک گھڑی میں خود اعتمادی کی تعمیر کے لیے عوام پر یہ ثابت کرنے کی ضرورت تھی کہ قومی صلاحیتیں ارتقا کا بنیادی ماخذ ہیں اور وسائل کے مالک عوام خاص طور پر محنت کش اور کسان ہیں نہ کہ گنے چنے طبقات جو قوم کے مادی اور انسانی وسائل کو اپنے مفادات میں لا کر بیرون ملک زرمبادلہ (دس ارب ڈالر سالانہ) بھیج رہے ہیں اور جائیدادیں بنا رہے ہیں اس لیے غیر ملکی ذہنی اثاثوں پر مبنی ہمارا مسابقتی نظام ٹیکنالوجی کے جدید انقلاب کے باعث بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اسی لیے آج حکومتوں کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بجلی، پیٹرول اور گیس کے نرخوں میں اضافہ کر کے بجٹ خسارہ پورا کریں۔ گزشتہ حکومت اور نگراں حکومت نے روپے کی قدر کو جب بے قدر کر دیا تو یہ ناگزیر ہوگیا کہ پیٹرول، ڈیزل اور مٹی کے تیل کی قیمتوں کو بڑھا دیا جائے اور یہ کام ایک عرصے سے ہو رہا ہے جس سے عوام کی قوت خرید کم ہوتی جا رہی ہے، سفید پوشی اور غربت میں انتہائی اضافہ ہو رہا ہے۔ نگراں حکومت کا پیٹرولیم پراڈکٹس کے نرخ بڑھانے کا غلط فیصلہ صارف کے زخموں کو ہرا کر رہا ہے۔ روپے کی قدر میں کمی کا مطلب یہ ہے کہ بین الاقوامی قیمتوں کے ساتھ چلنا ضروری ہے یا پھر نگراں حکومت زرتلافی دے جبکہ خزانہ بھی خالی ہے اور مسائل بھی بہت ہیں ویسے بھی پیٹرولیم پراڈکٹس پر ایک عرصہ ہوا زرتلافی گزشتہ حکومتوں نے آئی ایم ایف کے کہنے پر ختم کر دی تھی۔ روپے کی بے قدری سے پہلے مصنوعی طور پر پیٹرول کی قیمتوں کو سہارا دیا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ زرمبادلہ کو خطرناک حد تک ماضی میں مس مینج کیا گیا ہے صنعت کاری نہیں ہوئی۔ سی پیک میں کتنی پیش رفت ہوئی ہے اس سے پاکستان کو اب تک کیا فائدہ ہوا ہے اس کا علم نہیں، پاکستان نے سی پیک کے لیے کتنے نوجوانوں کو تربیت دی تا کہ ملازمتیں مل سکیں، اتنا ضرور علم ہے کہ زرمبادلہ کی بحرانی کیفیت کو نرم کرنے کے لیے دو فیصد سود پر ایک ارب ڈالر چین نے اسٹیٹ بینک میں جمع کرایا پانی سے بجلی بنانے کے تمام منصوبے تین عشروں سے تکمیل کے مرحلوں میں ہیں لاگت بڑھتی جا رہی ہے نہ تو دیامیر بھاشا، واسو ڈیم اور نیلم جہلم ڈیم مکمل ہوسکا کالا باغ ڈیم جو متنازعہ بنا دیا گیا ہے اس پر فضول بحث چل رہی ہے حال ہی میں پیٹرولیم پراڈکٹس پر جو دباؤ بڑھا ہے اس کی وجہ روپے کی مصنوعی قیمت کو زیادہ دیر تک برقرار رکھا اگر رکھنا ہی تھا تو برآمدات کو کو 30 ارب ڈالر تک لے جانا چاہیے تھا اس جانب بھی کسی کا دھیان نہیں نہ ہی چار پانچ ارب ڈالر درآمدات میں کمی کے لیے اقدامات کیے گئے لیکن دکھاوے کی ترقی پر سیکڑوں ارب روپے ضائع کیے گئے اب یہ ہوگا کہ بیرون ملک سے جو گیس درآمد کی جائے گی روپے کی قدر گرنے سے اس کے نرخ بھی بڑھیں گے اب یہاں یہ کہنا پڑتا ہے کہ غلطیاں یا بدعنوانیاں حکومتیں کریں اور اس کا خمیازہ عوام بھگتیں تو اس سٹیٹ کرافٹ کو کیا کہہ سکتے ہیں اسی لیے KE نے نیپرا سے کہا کہ تین روپے فی یونٹ اضافہ کیا جائے حالانکہ کے ای پہلے ہی خوب منافع کمار ہا ہے ٹیرف کا بڑھنا درآمدات کے نرخوں میں اضافہ، پیٹرول گیس کی قیمتوں میں اضافہ افراز زر کو ہوشربا بنا رہا ہے اسٹیٹ بینک کو سوچنا ہوگا کہ وہ کیا کرے ڈسکاونٹ ریٹ میں کتنا اضافہ کرے جو بھی کیا جائے گا افراط زر بڑھے گا مہنگائی جان لیوا ہوگی مجموعی طلب اور گروتھ ریٹ میں کمی آئے گی ٹرانسپورٹ کے کرائے مزید بڑھیں گے غریبوں کو پیدل چلنا ہوا چند امیر طبقے موٹر ہائی ویز کا لطف اٹھائیں گے بلواسطہ ٹیکس میں امید اور غریب کو یکساں ادائیگی کرنا پڑتی ہے غریب کے لیے پیٹرول کے نرخ عذاب جاں ہیں اور امیر کو اس کے بڑھانے کا علم ہی نہیں کرنٹ اکاؤنٹ کے خسارے کس طرح ایکسچینج ریٹ سے ایڈجسٹ ہوں گے یہ مسائل اور قرضوں کی ادائیگی آئندہ حکومت اس معاشی ماحول سے کس طرح نبرد آزما ہوگی کسی نے اس پر کوئی شیڈول پروگرام نہیں دیا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پیداوار کم ہوگی، لاگت زیادہ ہوگی عالمی مسابقت (برآمدات) زیادہ مشکل ہوگی درآمدات کی ویلو بڑھے گی

بیروزگاری کا بھوت منڈلاتا رہے گا ماضی کی غلطیوں پر ماتم کرتے ہوئے ان کو دہرایا جائے گا قرض لو اور خرچ کرو مصنوعی شرح نمو دکھاؤ خوشحالی کے خواب دکھاتے رہو اس کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے ٹریڈ اور انڈسٹری کی تنظیموں نے پیٹرولیم کے نرخوں کے بڑھنے پر شدید تنقید کی ہے ایف پی سی سی آئی کے وائس چیئرمین نے کہا ہے کہ اچھا رہے گا اگر نگراں حکومت پیٹرولیم کی قیمت 20 جون 2108 تک ہی پر رکھیں'' حکومتوں نے معاشی صورت حال اس قدر خراب کردی ہے کہ اب بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لیے ڈیزل جس کی فروخت 70 فیصد ہے اس پر 31 فیصد سیلز ٹیکس ہے ہائی اسپیڈ ڈیزل پر 17 فیصد ٹیکس ہے نگراں اور تو کچھ نہیں کرسکتے اسی سے ریونیو کمائیں گے چاہے عوام کی چمڑی اتر جائے۔ سیالکوٹ کے مالدار طبقے جن کے پاس بہت زرمبادلہ ہے ایمنسٹی اسکیم میں وہ نہیں آرہے تو ان سے پوچھا جائے کہ وہ کس طرح ملک کے اندر زرمبادلہ لانے پر راضی ہیں اب یہی ہوسکتا ہے کہ ان کی شرائط پر زرمبادلہ لایا جائے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ زرمبادلہ اندرون ملک لانے پر تیار ہیں اگر کوئی قدغن نہ لگائی جائے سرمایہ داری نظام میں یہ سب کرنا پڑتا ہے ایف پی سی سی آئی کے وائس چیرمین طارق حلیم کہتے ہیں'' پیٹرولیم پراڈکٹس کے زیادہ نرخ اسمگل شدہ پیٹرول و ڈیزل کی حوصلہ افزائی کریں گے پڑوسی ملکوں سے پندرہ سے بیس فیصد پیٹرولیم پراڈکٹس اسمگل ہوکر آرہے ہیں اور اس سے نگراں حکومت کو ریونیو کا نقصان ہورہا ہے اور کنزیومر کو ملاوٹی تیل مل رہا ہے۔'' ان معاشی پیچیدگیوں کو سپریم کورٹ حل نہیں کرسکتی یہ کام تو حکومتوں کا تھا جنہوں نے کچھ نہیں کیا سوائے سڑکیں بنانے کے اگر سندھ کے کسی علاقے میں 20 لاکھ کی آبادی ہے اور 86 لاکھ مویشی تو پانی کے قحط یا قلت میں مویشی پانی پئیں گے یا انسان یہ رہی ہمارے ملک کی 70 سالہ معاشی منصوبہ بندی ..... اب ایک اور تماشہ دیکھیے ایک رپورٹ سرکاری ذرائع سے 10-4-2017 کو شائع ہوئی۔ اس میں بتایا گیا کہ پیٹرولیم نکالنے والی کمپنیوں کے ساتھ پیٹرولیم وزارت کے آفیشل مل کر 86 ارب روپے کے گھپلے کرچکے ہیں اور ایف آئی اے 213 ارب روپے صرف گیس کمپنیوں سے حاصل کرچکی ہے ایف آئی اے کے مطابق چالیس فیصد بیرونی کمپنیاں مبینہ طور پر 86 ارب روپے کا گھپلا کرچکی ہیں اس کا حوالہ پیٹرولیم وزارت کی آڈٹ رپورٹ کا دیا جاتا ہے جس نے 5-1-2013 (جو ایف آئی اے کو دی گئی تھی) میں یہ بتایا کہ مذکورہ کمپنیوں نے 2102 سے 2015 تک اربوں روپے کے گھپلے پیٹرولیم لیوی اور گیس سرچارج میں کیے ہیں۔ آڈٹ رپورٹ کے مطابق 34 آئل ویزل سے ٹیسٹ پروڈکشن کے نام سے تیل مارکیٹ میں گزشتہ چھ برس سے فروخت ہورہا ہے قانون کے مطابق ٹیسٹ پروڈکٹ دو سال سے زیادہ نہیں کی جاسکتی اس کے بعد یا تو کنواں بند کردیا جائے یا پھر تیل کی فروخت کمرشل قرار دی جائے جن کمپنیوں کو 2002 میں تیل نکالنے کا لائسنس ملا تھا ان سے سابق وزارت پیٹرولیم نے 48 ارب روپے وصول کیے تاہم 86 روپے ابھی تک گرفت میں نہیں آئے اگر گیس اور پیٹرولیم کمپنیوں کی ملی بھگت سے یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے تو ملک کا کیا مستقبل ہوگا ؟ نگراں حکومت نے پیٹرولیم پراڈکٹس پر سیلز کی شرح 12 فیصد سے بڑھا کر 17 فیصد کردی لیکن وہ پراسیسنگ فارمولا کے دو اہم پہلو نظر انداز کر گئے پہلی بات تو یہ ہے کہ جنرل سیلز ٹیکس جو پیٹرولیم پراڈکٹس پر نافذ ہے اس سے قومی خزانے کو 140 ارب روپے ماہانہ حاصل ہوتے ہیں یکم جولائی کو نگرانوں نے سیلز ٹیکس 5 فیصد بڑھا دیا ہائی اسپیڈ ڈیزل جس پر 24 فیصد سیلز ٹیکس تھا اسے 7 فیصد بڑھا کا 31 فیصد کردیا بالفاظ دیگر نگرانوں کو فکر لاحق تھی کہ ایسا نہ کیا گیا تو بجٹ کا خسارہ خطرناک حد تک بڑھ جائے گا لیکن نگرانوں کو علم ہونا چاہیے کہ سیلز ٹیکس بھی بالواسطہ ٹیکس ہے جس کا سارا بوجھ عوام پر پڑتا ہے اس سے ٹرانسپورٹ بجلی کے نرخوں میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر اشیائے خوردو نوش اور ملبوسات وغیرہ غرضیکہ ہر شے کے نرخوں میں اضافہ ہوگا۔ مینوفیکچرنگ زراعت اور صنعتی پیداور کی لاگت بڑھے گی ان معاملات پر بحث نہیں ہوتی کہ حکومتوں نے کیا کارکردگی دکھائی ہے معاشی نقطہ نظر سے دیکھیں کہ جتنا بجٹ کا خسارہ بڑھے گا اتنا ہی افراط زر بڑھے گا اس لیے خرچ کرنے کی آمدنی عام آدمی کے پاس بہت کم رہے گی اب یہ بتایا جائے کہ کیا بجٹ کا خسارہ زیادہ خطرناک ہے یا پیٹرولیم پراڈکٹس کی قیمتوں کو بڑھانا زیادہ نقصان دہ ہے۔ معیشت دانوں کو پتہ ہے کہ بجٹ کا خسارہ قیمتوں کو اور قرضوں کو بھی بڑھائے گا محتاج معیشت کو فروغ دے گا منتخب حکومت اگر صنعت کاری نہیں کرسکتی بے روزگاری ختم نہیں کرسکتی زراعت درست نہیں کرسکتی قرضوں کا نعم البدل براہ راست ٹیکس وصول نہیں کرسکتی تو پھر اسے حکومت کرنے کا کیا حق ہے؟ آئل مارکیٹنگ کمپنیوں کا موقف ہے کہ نومبر 2017 سے فروری 2018 تک جی ایس ٹی وصول نہ ہونے پر 845 ملین روپے کا نقصان ہوا ہے پیٹرولیم لیوی کو دگنا کردیا گیا اور یہ بھی عوام ادا کریں گے نہ ڈیمز بنے' نہ ہندوستان کو بڑے ڈیمز بنانے سے روک سکے' نہ تالاب بنا سکے' نہ برآمدات بڑھا سکے نہ ہی درآمدات کم کرسکے علاج معالجے اور تعلیم کی فروخت تو موضوع ہی نہیں اور نہ ہی 95 ارب ڈالر کا قرضہ اور 35 ارب ڈالر' توازن ادائیگیوں کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے البتہ گردشی قرضہ ایک ہزار ارب تک پہنچ گیا ہے جو بجلی والوں کو ادا کرنا ہے تمام بجلی گھر نقصان میں جارہے ہیں تو پھر فائدے میں کون ہے؟؟

ادب، ادیب اور جمہوری شعور

مسلم شمیم

جمہوریت سیاست دانوں کی ضررت ہے مگر ہم ادیبوں شاعروں اور اہل فکر و دانش کی ضرورت بھی ہے اور آدرش بھی۔ ادب کا جمہوری آدرش سے رشتہ نا تا روح اور جسم کے رشتوں کی طرح ہے کیونکہ حریت فکر و نظر کا بلا شرکت غیرے گہوارہ اور سرچشمہ جمہوریت ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ جمہوریت عصر جدید کی شناخت ہے اور آج کی دنیا کے لیے ایک جامع نظریہ اور فلسفہ حیات کا درجہ اختیار کر چکی ہے جمہوریت ایک سیاسی نظام کے علاوہ ایک طرح کا طرز احساس ہے۔ جمہوری رویہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک طرف معقولیت پسندی کی سند مقصود ہوتا ہے تو دوسری طرف رواداری اور روشن خیالی کا معیار بھی۔

امن اور سیکولرازم یعنی ہمہ دینیت جمہوریت کے ناگزیر لوازم میں سے ہیں۔ ادب کی صحت مند قدروں کا فروغ جمہوریت کے بغیر خام خیالی ہے، بلکہ یہ کہنا برحق ہوگا کہ معاشرے کے لیے فلاح اور نجات کا واحد راستہ جادۂ جمہوریت ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ جمہوریت عصر جدید کی شناخت ہے اور آج کی دنیا کے لیے ایک جامع عقیدہ اور فلسفۂ حیات کا درجہ اختیار کر چکی ہے، ایک ایسا عقیدہ جو زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے اور سماج کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے جمہوریت آج ایک سیاسی اور سماجی نظام کے علاوہ ایک طرز احساس بھی ہے اور ایک نظام فکر بھی۔ جمہوری رویہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک طرف معقولیت کی سند تصور کیا جاتا ہے تو دوسری طرف رواداری اور روشن خیالی کا معیار۔ جمہوری مزاج کی عدم موجودگی ایک معاشرے کی پسماندگی کا اظہار کرتی ہے۔ جمہوری روایات و اقدار کی پاسداری عین شرف آدمیت کی پاسداری ہے۔ جمہوریت کی جامعیت اور وسعت کا تعین کرنے کے لیے کتنے ہی سابق اور لاحقے ضبط تحریر میں لائے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً بالواسطہ جمہوریت، بلا واسطہ جمہوریت، صدارتی جمہوریت، پارلیمانی جمہوریت، وحدانی جمہوریت، وفاقی جمہوریت، عوامی جمہوریت، قومی جمہوریت، سوشلسٹ جمہوریت، جمہوری مرکزیت، اقتصادی جمہوریت اور خالص جمہوریت وغیرہ۔ غرض یہ کہ جمہوریت کی ہمہ گیری اور اس کے مختلف نظری اور عملی پہلوؤں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جن سابقوں اور لاحقوں کے حوالے سے جو مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کیے گئے ہیں، ان کا مطالعہ بھی ذہنوں کو جلا بخشنے کے لیے ناگزیر ہے۔

جمہوریت کی مقبولیت آج اس منزل میں ہے کہ جمہوریت دشمن عناصر جمہوریت دشمنی کا فریضہ انجام دیتے وقت بھی جمہوریت کا جو کلمہ پڑھتے ہیں اور اپنی جمہوریت دشمنی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے مختلف النوع اصطلاحوں کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں پابند جمہوریت، بنیادی جمہوریت، اسلامی جمہوریت اور شورائی جمہوریت جیسی اصطلاحات انہی مقاصد اور مطمح نظر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس صدی کے بدترین آمروں کو بھی جمہوریت کو بالاعلان مسترد کرنے کی جرات نہیں ہوئی، بلکہ انہوں نے خود کو جمہوریت کا بڑا اور حقیقی چمپئن اور محافظ کہہ کر رائے عامہ کو دھوکا دینے اور گمراہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

جمہوریت دراصل انسانی معاشرے میں ہزاروں سال سے ہونے والے معرکہ خیر و شر کی فتح کی امین ہے کیونکہ جمہوریت کی تین بنیادیں ''آزادی''، ''مساوات'' اور اپنی حکومت آپ'' گویا وحدت انسانیت اور مساوات کے اعلان نامے کا درجہ رکھتی ہیں۔ جہاں سماج میں پائی جانے والی ہر تمیز و تفریق کی جمہوریت نفی کرتی ہے اس کے ساتھ ان تمام نظریات و عقائد، تصورات و افکار اور مفروضوں کو بھی رد کرتی ہے جن سے سماج میں نابرابری اور تمیز و تفریق کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ جمہوریت عوام کے اقتدار اعلیٰ کی علمبردار ہے۔ جمہوریت رنگ و نسل، زبان و ثقافت، مذہب و جنس کسی اعتبار سے انسانوں کے درمیان تمیز و تفریق کے کسی استدلال کو قبول نہیں کرتی، بلکہ ان تمام تنگ نظریوں، تعصّبات اور شاونزم کو جو کسی سماجی ناانصافی اور نابرابری کا جواز فراہم کرتا ہو، ذہنی کج روی، گمراہی اور باطل قرار دیتی ہے۔ نائب اللہ، ظل سبحانی اور اس قسم کے آسمانی حوالوں سے حکمرانی کے حق کا دعویٰ کرنے والے اب دنیا میں نہیں ہوں گے۔ اگر کسی نے یہ شوق چرایا تو اس کو شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر جمہوری آدرش کی توثیق کی اہم دستاویز ہے اور تاریخ میں انسانی مساوات کی اصولی فتح کا روشن ترین باب ہے۔ حقوق انسانی کے اس چارٹر پر دستخط کرنے والوں میں وہ افراد اور عناصر بھی شامل ہیں جو دراصل اس

کے مخالف ہیں مگران سے انکاری ہونا اب ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ادیب کا جمہوری آدرش اور جمہوری شعور سے ناتا روح اور جسم کے رشتوں کی طرح ہے۔ حریت فکر کا بلا شرکت غیرے گہوارہ اور جمہوریت ہی ہے۔ اظہار رائے کی آزادی اس کی تخلیقی سرگرمیوں کا سرچشمہ قرار پاسکتی ہے اس کے حق کے لیے ادیب روز اوّل سے سرگرداں اور نبرد آزما ہے۔ بیسویں صدی میں ادیبوں نے جمہوری آدرش کے لیے صرف اپنے قلم سے جہاد نہیں کیا بلکہ اس کے تحفظ کے لیے میدان کارزار میں اپنی جان کے نذرانے بھی پیش کیے۔ ۱۹۳۳ء میں یورپ میں فسطائیت کے فتنے نے سر اٹھایا اور تہذیب وتمدن اور جمہوری اقدار کو حقیقی خطرات درپیش ہوئے تو ادیبوں نے بین الاقوامی پیمانے پر صدائے احتجاج بلند کی اور فسطائیت کے خلاف اپنی صف آرائی کی۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس کے مقام پر کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی کانگریس بلائی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب دنیا کے وہ سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہو گئے جو جمہوریت' روشن خیالی' انسان دوستی اور ترقی پسندیت پر یقین رکھتے تھے انہوں نے اس کانفرنس میں یہ طے کیا کہ ادیب وشاعر کو اپنے ذاتی نہاں خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے جمہوریت دشمن' رجعت پسند طاقتوں کے مد مقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اس موقع پر ادیبوں کے نام جو اپیل شائع کی گئی اس میں کہا گیا:

''رفیقانِ قلم موت کے خلاف زندگی کی ہم نوائی کیجیے۔ ہمارا قلم ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں' روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں' کارخانے داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔''

ہماری قومی تاریخ کے ستر سال کا بیشتر دور جمہوریت دشمن اقتدار کا دور رہا ہے۔ ملک میں جاگیردار' نوکر شاہی اور دیگر مراعات یافتہ طبقات اپنے غیر جمہوری اقتدار اور لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو دوام بخشنے کے لیے پاکستانی عوام کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم رکھنے کی سازشوں میں روز اوّل ہی سے مشغول رہے ہیں جبکہ ملک کی ترقی پسند جمہوری قوتیں ایسی مکروہ سازشوں کو تشت از بام کرنے اور جمہوری اقدار کے تحفظ اور انسانی وقار کی بحالی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتی رہی ہیں۔ ان مصروف پیکار طاقتوں میں عوام دوست ادیب پوری تندہی کے ساتھ شامل عمل رہے ہیں جن کی پاداش میں طرح طرح کے مصائب و آلام سے گزرنا ایک قدرتی امر تھا۔ دار و گیر اور قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ ایسے ادیبوں پر معاش کے دروازے بھی بند کیے گئے' ان کی تصانیف' رسائل وجرائد پر نہایت تواتر کے ساتھ پابندیاں عائد کی جاتی رہیں۔ حکومتی حلقوں کے باہر ان کے حلیف مفاد پرست موقع شناس اور تنگ نظر نام نہاد دانشور عوام دوست ادیبوں کے خلاف نت نئے اتہام تراشنے اور دشنام طرازی میں مصروف رہے ہیں۔ وہ گمراہ کن نعروں کے ذریعے جمہوری پسند ادیبوں کو پاکستانی معاشرے میں فعال کردار ادا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ان تمام مراحل سے سرخ رو و کامران گزرے۔ ادب اور ریاستی وفاداری کے حوالے سے وہ اپنی تحریروں میں اس عزم کا بار بار اعادہ کرتے رہے ہیں کہ ہم ریاست سے وفاداری کو عوام سے وفاداری کے پیمان کو مشروط کرتے ہیں نہ کہ حکومت وقت کی کاسہ لیسی سے۔

پاکستان کے عوام دوست ادیبوں' دانشوروں اور فنکاروں نے عوام کے رنج والم اور ان کی محرومیوں سے آگاہی کو اپنی تحریروں کا نقطہ ارتکاز بنایا عوامی امنگوں کی ترجمانی کی' فوجی آمریت کے ادوار میں جمہوری تحریک اور عوامی جدوجہد میں وہ ان کے ساتھ رہے اور اپنی تخلیقات کی کہکشاں ان کی آرزوؤں اور تمناؤں سے سجاتے رہے ان ادیبوں نے سماجی شعور کے ارتقاء اور معاشرتی تقاضوں کا بھرپور اظہار کیا ہے اور ادب میں سائنسی نقطہ نظر' جمہوری اقدار اور انسان دوستی کو فروغ دیا ہے انہوں نے ادب میں قنوطیت' انفعالیت' قدامت پرستی' مقدر پرستی اور زندگی کو فریب محض سمجھنے کے تصورات کو مسترد کیا ہے اور اس طرح ادب اور زندگی کے رشتے کو تصوری طور پر واضح کیا۔ ہمارے ملک کے باشعور ادیبوں نے مغربی استعمار کے آوردہ اور پروردہ خطرناک رجحانات مثلاً ہیت پرستی' سریت' حیوانیت' فحش نگاری' جنسی انتشار پسندی' ایہام پسندی' رہبانیت وغیرہ کو بے نقاب کیا' یہ ادیب ادب کو زندگی کا ترجمان اور معمار سمجھتے ہوئے زندگی کو خوبصورت تر دیکھنے کی خواہشوں کی تعبیر پیش کرتے رہے ہمارے ادیبوں اور فنکاروں نے جمہوریت کی ترقی اور فکر و خیال کی آزادی کی جدوجہد میں جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ ہمارا قابل فخر ورثہ ہیں۔ شہری آزادیوں کا تحفظ اور جمہوری عمل کی کامیابی کا مسئلہ ادیب اور عوام' دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے جب عوام کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنے تجربے کی روشنی میں آزادی کے ساتھ اپنے لیے اجتماعی ترقی کا راستہ ڈھونڈیں اور آزادی سے اس راستے پر چلیں تو سماج میں وہ تخلیقی قوتیں فروغ پاتی ہیں جن سے ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک ملتی ہے اور

جن کی فنکارانہ ترجمانی سے ہماری کاوشیں نئی تخلیق بن جاتی ہیں اور اگر اس کے ساتھ ادیبوں کو اپنے ضمیر اور فکر کے مطابق لکھنے اور بولنے کی بھرپور آزادی حاصل ہو تو ہم اپنی سماجی زندگی کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں اور اپنی ادبی تخلیقات کی مدد سے زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

جمہوریت کا پودا ہمارے یہاں شروع سے ہی صرصر و سموم کی زد میں ہے۔ اسے پنپنے اور پھلنے پھولنے کا ماحول اور فضا اکثر و بیشتر میسر نہیں رہی چنانچہ معاشرہ جمہوریت کے ثمرات سے یکسر محروم ہے کچھ حلقے جمہوریت کو محض ایک سیاسی نظام اور نظام حکومت جان کر اپنے ملک میں اس کی ناکامیوں اور ارباب حل وعقد کے ہاتھوں اس کی بے چہرگی کا رونا رو کر سرے سے جمہوریت کے نظریے کی نفی کرنے لگے ہیں۔ کچھ حلقوں نے اپنے مسائل کے لیے جمہوری عمل کو دور از کار جان کر فسطائی سیاست کی راہ اپنائی۔ تشدد اور کشت وخون کی عمل داری انہیں دہشت گری کی دہلیز تک لے آئی ہے اور اب تک جو نتائج سامنے آئے ہیں ان سے سوائے شرمندگی اور مایوسی کے معاشرے کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ نقصانات جو ہوائے وہ ناقابل بیان ہی کہے جا سکتے ہیں۔ کچھ حلقے ایسے بھی ہیں جو صدیوں پرانے تجربات کو دہراتے اور ماضیٔ بعید کے سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کے احیا کی بات کرتے ہیں اور سماجی ارتقاء کے قوانین اور تغیر وتبدّل کے ضوابط سے قطعی نابلد اور بے بہرہ ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ابتدائی سطور میں جمہوریت کی تعریف وتفسیر بیان کرتے ہوئے یہ بات کہی گئی ہے کہ جمہوریت ایک سیاسی فلسفے، نظریے اور نظام کے علاوہ ایک طرزِ فکر واحساس، طرزِ معاشرت اور نظامِ زندگی کا درجہ رکھتی ہے۔ جمہوریت کا آدرش شرفِ بشر سے عبارت ہے مساوات وآزادی سے عبارت ہے۔ جمہوریت ہر قوم کے امتیاز وتفریق کی نفی کرتی ہے۔ کوئی معاشرتہ جو انسانی آبادی میں کسی پیمانے اور معیار سے انسانوں کے درمیان امتیاز وتفریق کرتا ہے وہ معاشرہ جمہوری کہلانے کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ یہ کہنا ناگزیر ہے کہ سیکولرازم اور جمہوریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور بغیر سیکولر اصولوں کو اپنائے جمہوری حکومت اور نظام کا تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سیکولرازم کے اصولوں کی پاسداری ہی سے کسی معاشرے کے تمام شہریوں کی مساویانہ حیثیت کا تعین ممکن ہے۔ کسی تفریق اور امتیاز کے ہوتے ہوئے جمہوری نظام کا دعویٰ غلط اور گمراہ کن ہے، اگر تمام شہری یکساں حقوق ومراعات نہیں رکھتے۔ مذہبی بنیادوں پر تفریق اور امتیازی سلوک روا رکھا جانا جمہوریت کی نفی ہے سیکوازم کو لادینیت کا نظریہ بتا کر رائے عامہ کو گمراہ کیا جاتا رہا ہے۔ سیکولرازم لادینیت کا نظریہ نہیں بلکہ ہمہ دینیت کا پرچارک نظریہ ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں چلنے والی تحریک پاکستان اقتصادی محرکات کی حامل سیاسی تحریک تھی جس کی منزل مقصود برصغیر کی مسلمان برادری کے لیے علیحدہ وطن کا حصول تھا۔ تحریک پاکستان کسی طور مذہبی تحریک نہیں تھی۔ یہ تاریخی حقائق پیش نظر رہیں کہ تحریک پاکستان کی مخالفت میں تمام مذہبی جماعتیں ہم خیال اور ہم آواز تھیں جن میں جماعت اسلامی، جمعیت علمائے ہند، خاکسار تحریک اور دیگر مذہبی جماعتیں شامل تھیں۔ تحریک پاکستان کو تحریک ناپاکستان کہا گیا ہے اور بانی تحریک قائداعظم کو کافر اعظم کہا گیا۔ قائداعظم کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر یہ کہنا صد فیصد سچائی پر مبنی ہوگا کہ وہ ایک پختہ کار سیکولر جمہوریت پسند مدبر تھے اور ان کا تصور پاکستان خالص جمہوری فلاحی ریاست تھا جس میں مذہبی عقیدے کی بنیاد پر کسی تمیز وتفریق کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ مورخہ ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کا دستور ساز اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ان کے تصور پاکستان کا منشور تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ تحریک پاکستان کے مخالفین نے قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان کو ہائی جیک کر لیا اور اس طرح قائداعظم کے نقوش قدیم تاریخ کے صفحات سے معدوم کر دیے گئے اور نتیجتاً ہمارا ستر سالہ قومی سفر ترقیٔ معکوس کا سفر بن گیا۔

جمہوریت ہمارے یہاں ہمیشہ آزمائشوں سے دوچار رکھی گئی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ جمہوریت ہمارے یہاں ہمیشہ سرِ دار رہی ہے اور بار بار اسے پھانسی دی گئی ہے مگر یہ بڑی سخت جان واقع ہوئی ہے اور بات کچھ دوسری بھی ہے کہ جمہوریت کا دراصل کوئی نعم البدل (Substitute) ہے ہی نہیں۔ کوئی معاشرہ جادۂ جمہوریت کو ترک کر کے نہ تو محفوظ راستوں میں سفر کر سکتا ہے اور نہ معاشرے کے لیے فلاح وترقی کی منزلیں ڈھونڈ سکتا ہے۔ جمہوریت کا سفر صبر آزما سفر ہے کیونکہ جمہوریت کا سفر کا کوئی Short cut بھی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں پوری معاشرتی سیاسی اور اقتصادی زندگی غیر یقینیت کا شکار رہی ہے اور یہ غیر یقینیت آج کچھ سوا نظر آ رہی ہے۔ یہ غیر یقینیت جمہوری عمل سے روگردانی کا لازمی نتیجہ ہے معاشرے کے ہر طبقے کا مفاد جمہوریت سے وابستہ ہے اور یہی سب کے لیے نجات اور فلاح کا راستہ ہے لہٰذا جمہوریت کے پودے کی آبیاری سب کا فریضہ بنتا ہے۔ عالمی مسلم معاشرہ عمومی اور جنوبی ایشیا کا مسلم معاشرہ خصوصی طور پر مختلف نوعیت کی انتہا پسندی کے اندھیروں میں گھرا ہوا ہے یہ انتہا پسند بدترین فاشزم کا روپ دھار چکی ہے اور اس کا نقطہ عروج دہشت گردی کو چھو رہا ہے اس تناظر میں جمہوری آدرش کے فیوض وبرکات کے حق میں رائے عامہ کا ہموار کرنا قلم کاروں کا نصب العین اور فرض منصبی ٹھہرتا ہے۔ ☆☆

کارل مارکس کی 200ویں سالگرہ

صباح الدین صبا

نہ ہارا ہے عشق اور نہ دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے ہوا چل رہی ہے

☆

اب سے 200 سال قبل 5 مئی 1818 کو ''کارل مارکس'' جرمنی کے شہر'' ٹرائر'' میں پیدا ہوا۔ دو صدیوں کے بعد آج بھی مارکس اور مارکسزم پوری طرح روشن اور توانا ہیں مارکس کے چاہنے والوں اور مارکسزم کے ماننے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے دنیا کی سب سے بڑی آبادی والے ملک چین نے مارکس اور مارکسزم کا پرچم سربلند رکھا ہے اس کے علاوہ ویت نام، شمالی کوریا، کیوبا، لاؤس اور کمبوڈیا بھی مارکسزم کے علمبردار ہیں لاطینی امریکہ کے متعدد ملکوں میں مارکس کے نظریات سے ہمدردی رکھنے والوں کی حکومتیں قائم ہیں علاوہ ازیں امریکہ اور یورپ سمیت مختلف ممالک میں مارکسی رجحانات مقبول ہورہے ہیں۔

مارکس کی 200ویں سالگرہ کی مناسبت سے چین میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے چین کے صدر اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری ژی جن پنگ نے بجا طور پر کہا کہ ''انسانی معاشرے میں بڑی اور نمایاں تبدیلیوں کے باوجود دو صدیوں بعد آج بھی پوری دنیا میں مارکس کا احترام اور مقام اسی طرح برقرار ہے اور اس کا نظریہ سچائی کی شاندار روشنی سے پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے''۔

Two centuries on, despite huge and profound changes in human society.The name of Karl Marx is still respected all over the world and his theory sitll shines with the brilliant light of truth.

صدر ژی جن ینگ نے کہا کہ مارکس پوری دنیا کے مزدور طبقے کے لئے انقلاب کا سب سے بڑا استاد ہے۔ وہ مارکسزم کی بنیاد رکھنے والے مارکسٹ پارٹیوں کا خالق، بین الاقوامی کمیونزم کی راہ اجاگر کرنے والا اور جدید دنیا کا سب سے بڑا مفکر ہے۔ عظیم رہنما کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کارل مارکس نے اپنی پوری زندگی مشکلات رکاوٹوں اور نامساعد حالات کے باوجود بنی نوع انسان کی نجات اور سچائی کی تلاش میں دنیا کو بدلنے اور ایک نئی دنیا کی تشکیل کی جستجو میں گزاردی۔ انہوں نے کہا کہ مارکس نے ہمارے لئے جو سب سے قیمتی چیز چھوڑی ہے وہ اس کے نام سے منسوب نظریہ مارکسزم ہے۔ اس نظریے کی روشنی میں انسان نے تاریخ کے قانون کی یافت اور خود اپنی نجات کی راہ تلاش کی۔ چینی صدر نے کہا کہ مارکسزم ایک سائنٹیفک نظریہ ہے جو انسانی معاشرے کی ترقی کا قانون تخلیقی انداز میں وضع کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ تاریخ کے مادی تصور اور نظریہ قدر زائد کو ترقی دیکر مارکس نے بتایا کہ انسان کیونکہ احتیاجات کی حدود سے نکل کر نجات کی منزل حاصل کرے گا اور بنی نوع انسان کے لئے نجات کی راہ روشن کی۔ انہوں نے کہا کہ پہلی بار مارکسزم نے عوام کے نقطہ نظر سے نجات اور آزادی کی راہ تلاش کی۔ چینی صدر نے کہا کہ عملیت پسندی مارکسزم کی اہم صفت ہے جو اسے دوسرے نظریوں سے ممتاز بناتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ واحد نظریہ ہے جو مسلسل ترقی کررہا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہمیشہ جوان ہے اور انسانی معاشرے کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ چینی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری نے کہا کہ کمیونسٹ مینی فیسٹو کی اشاعت کے 170 سال بعد مارکسزم دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکا ہے اور اپنے اثرات کی گہرائی، گیرائی اور وسعت کے اعتبار سے کوئی دوسرا نظریہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انہوں نے کہا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد متعدد سوشلسٹ ممالک معرض وجود میں آئے خاص طور سے عوامی جمہوریہ چین کے

قیام نے دنیا میں سوشلسٹ قوت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ بین الاقوامی سوشلزم کی تعمیر میں عارضی مشکلات کے مراحل ضروری آئے ہوں گے لیکن انسانی معاشرے کی ترقی کا عمومی رجحان کبھی تبدیل نہیں ہوا اور ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ چینی صدر نے کہا کہ مارکسزم نے نہ صرف دنیا کو تبدیل کیا بلکہ اس نے خود چین کو بھی یکسر بدل ڈالا۔ انہوں نے کہا کہ روس کے اکتوبر انقلاب نے چین میں مارکسزم لینن ازم کو متعارف کرایا اور روسی انقلاب نے چینی عوام کی زندہ رہنے کی جدوجہد کو نئی جہت عطا کی اور کمیونسٹ پارٹی آف چائنہ کے وجود کا جواز فراہم کیا۔ انہوں نے کہا کہ چینی معاشرے میں ہونے والی شاندار تبدیلیوں اور ہمہ گیر ترقی نے ثابت کیا کہ ہم صرف سوشلزم کی راہ پر چل کر ہی چین کو بچا سکتے ہیں۔ چین کے صدر اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری نے کہا کہ چین آج بھی سوشلزم کی راہ پر گامزن ہے اور آئندہ بھی مارکسزم کا پرچم سربلند رکھے گا۔

چین میں گزشتہ کئی دہائیوں سے منڈی کی معیشت سرگرم ہے جس کے نتیجے میں چین دنیا کی اہم معاشی قوت کے طور پر ابھر رہا ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد سوشلزم کا جھنڈا اٹھانے والا سب سے بڑا ملک چین ہے اور آج بھی چین میں ریاست کی تحویل میں چلنے والی کمپنیاں معیشت میں بالادستی رکھتی ہیں۔

تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ منڈی کی قوتوں کی آزادروی نے چینی معیشت میں توازن کو بگاڑا ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھا ہے دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان بھی توازن برقرار نہیں رہ سکا یہی وجہ ہے کہ چینی کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل اور چین کے صدر ژی جن پنگ نے پارٹی کے حالیہ کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج چینی معاشرے کے بنیادی تضاد کا تعین کرکے ہی آگے بڑھا جاسکتا ہے انہوں نے بنیادی تضاد کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ عوام کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور غیر متوازن ترقی کے درمیان تضاد آج کے چینی معاشرے کا بنیادی تضاد ہے۔ لہٰذا پارٹی کا بنیادی فریضہ اس تضاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھنا اور نابرابری کو برابری میں تبدیل کرنا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑی آبادی والے ملک چین کے علاوہ ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ اور یورپ کے مختلف ممالک میں کارل مارکس کی 200 ویں سالگرہ جس ولولہ اور جوش وجذبہ کے ساتھ منائی گئی ہے وہ خود اکیسویں صدری میں مارکس اور مارکسزم کے متعلق ہونے کا بڑا ثبوت ہے۔

لاس انجلز ٹائمز لکھتا ہے کہ کارل مارکس کے 200 ویں سالگرہ پر جرمنی میں ہنگامہ خیز بحثوں کا آغاز ہوگیا جس نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے دیوار برلن گرنے کے تین دہائیوں بعد آج جرمنی پر ایک بھوت منڈلا رہا ہے اور وہ بھوت کارل مارکس ہے۔

کارل مارکس کی 200 ویں سالگرہ پوری دنیا میں نئے جوش وجذبے اور نہایت اہتمام کے ساتھ منائی گئی۔ مارکس کا آبائی شہر ٹرائر مغربی جرمنی میں واقع ہے سب سے زیادہ جوش وخروش اس بار جرمنی اور خاص طور سے ٹرائر میں دیکھنے میں آیا جہاں مارکس کی سالگرہ کے حوالے سے مختلف اوقات میں 600 تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔

سرمائے دار جرمنی میں مارکس کی یاد بڑے پیمانے پر منانے یا نہ منانے کی بحث اس وقت ختم ہوگئی جب گزشتہ سال ٹرائر سٹی کونسل نے چین میں تیار کردہ مارکس کے مجسمے کو بطور تحفہ قبول کرنے سے اتفاق کرلیا۔

ٹرائر میں مارکس کی سالگرہ کی تقریبات کا آغاز اس کے آبائی گھر کے ساتھ 18 فٹ اونچا مجسمہ نصب کرکے کیا گیا یہ مجسمہ چینی مجسمہ ساز وو ویشان (Wu Weishan) نے تیار کیا ہے جو عوامی جمہوریہ چین نے تحفے کے طور پر بھیجا۔ مجسمہ نصب کرنے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ٹرائر کے میئر نے کہا کہ یہ خوبصورت یادگار لوگوں کے مارکس کے ساتھ محبت کو اجاگر کرنے اور اس کی تحریروں کے مطالعہ کی طرف راغب کرنے میں مددگار ہوگی۔

کارل مارکس کی 200 ویں سالگرہ کے موقع پر اخبارات و جرائد نے بھی انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔

NewYork TimesEditor:-

Today the legacy of Marx would appear to be live and well. since the

turn of the millinium countless books from scholarly writers to popular biographies broadly endorsing Marx reading of capitalism and its enduring relevance to our neoliberal age.

Libaral Economist Nouriel Roubini: Marx s Conviction that Capitalism has an inbuilt tendency to destroy itself remain as prescient as ever.

اگر انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال برقرار ہے تو مارکس کی تعلیمات کی ضرورت اور افادیت بھی موجود ہے اگر عالمی سرمائے دارانہ نظام بحران کا شکار ہے انسان کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہے تو مارکس کی پیشگوئیاں بھی درست ہیں اگر طبقاتی تقسیم برقرار ہے طبقاتی آویزش موجود ہے تو مارکس بھی زندہ ہے اور مارکسزم بھی پوری طرح متعلق ہے۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو کا آغاز اس معروف جملے سے ہوتا ہے کہ یورپ کے سر پر کمیونزم کا بھوت منڈلا رہا ہے ۔'' A specter is haunting europe the spector of Communism.'' گزشتہ دو صدیوں میں ہونے والے واقعات نے جہاں مارکس اور مارکسزم کو مقبول عام کیا وہیں بیسویں صدی کے آخر میں پولینڈ سے اٹھنے والی روانقلاب کی لہر اور مشرقی یورپ اور خود سوویت یونین کے انہدام نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے حامیوں اور سامراجی میڈیا کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع پر فراہم کیا کہ مارکس اور مارکسزم کا قصہ ختم ہوا ۔امریکی حکمرانوں اور ان کے لے پاک دانشوروں نے دعویٰ کیا کہ سوشلزم ختم ہوگئی، سرمایہ دارانہ نظام کو حتمی فتح حاصل ہوئی انسانی تہذیب مکمل ہوگئی اور امریکہ دنیا کی قیادت کرنے والا واحد اہل ملک ہے اسی مفروضے کے تحت امریکی بالا دستی پر مبنی نئے عالمی نظام کا تصور پیش کیا گیا۔لیکن 2008 میں جرمنی سے شروع ہونے والے اقتصادی بحران نے پورے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی چولیں ڈھیلی کردیں اور خود سرمایہ دار دنیا کے ماہرین معیشت وسیاست اس نتیجہ پر پہنچنا شروع ہوئے کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا بحران بنیادی نوعیت کا ہے اور اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں رہی۔امریکی ماہر معیشت والراسٹین (Waller Stein) کا کہنا ہے کہ سرمایہ دارانہ عالمی نظام اب ڈھانچہ جاتی بحران کا شکار ہے (حتمی، نا قابل حل بحران)

'' Capitalist world system is now in a structural crises (Final, in soluble crises)''

اب امریکی محکمہ دفاع پینٹا گون نے اپنی ایک تحقیقی رپورٹ میں اعتراف کیا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی قیادت میں قائم ہونے والا عالمی نظام زوال پذیری کا شکار ہے۔

" The us backed later international order established after world war 2 is fraying and may even be collapsing, leading the united states to loose its position of primacy in world affairs."

مندرجہ بالا ماحول میں 5 مئی 2018 کو دنیا نے مارکس کی 200ویں سالگرہ منائی ۔اس موقع پر یورپ کے مختلف ممالک میں تقاریب سیمینارز، لیکچرز اور ورکشاپس منعقد ہوئیں ۔ عالمی ذرائع ابلاغ میں مارکس کی 200ویں سالگرہ سے متعلق خبریں، مضامین، جائزہ رپورٹیں اس دھوم دھام سے شائع ہوئیں جس کا آج سے پہلے تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس موقع پر لاس اینجلز ٹائمز نے لکھا کہ آج جرمنی پر ایک بھوت منڈلا رہا ہے اور وہ مارکس کا بھوت ہے۔

" A specter in haunting Germany the Specter of Karl Marx"

سامراج کی ٹوٹ پھوٹ کا عمومی بحران تیز تر ہو رہا ہے اور آئندہ برسوں اور دہائیوں میں اس کیفیت میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ پوری دنیا کے عوام کی مشکلات میں خطرناک حد تک اضافہ منطقی طور پر مزاحمت کی بین الاقوامی لہروں کو جنم دے گا۔ یہ بات عملی طور پر واضح ہوتی جاری ہے کہ سامراج کا مستقبل تباہی کے سوا کچھ نہیں ۔ بین الاقوامی پرولتاریہ کا تاریخی فریضہ ہے کہ وہ سامراج کی حتمی شکست کو جلد از جلد یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کرے۔

ایک غیر سرکاری تنظیم کے سروے کے مطابق 2017 میں دنیا میں دولت کا

ارتکاز اس طرح تھا کہ کل دولت کا 82 فیصد آبادی کے ایک فیصد کے ہاتھ میں ہے جبکہ دنیا کی نصف آبادی یعنی 3.7 ارب لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہے۔ نا برابری میں تیزی سے اضافہ خود سامراجی ممالک میں بھی ہو رہا ہے۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں تیزی سے ہونے والی نجکاری نے اقتصادی محرومیوں اور نیم نوآبادیاتی، نوآبادیاتی تسلط اور جبر میں اضافہ کیا ہے۔

تیل، کان کنی اور جنگلات میں کثیر القومی کمپنیوں کی مداخلت سے بڑے پیمانے پر عام لوگوں کی اپنی زمینوں سے بیدخلی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے (لاطینی امریکہ، افریقہ، ترکی اور ہندوستان) ان ملکوں میں قدرتی اور ماحولیاتی، موسمی تبدیلیاں اور تباہیاں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔

عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے گہرے ہوتے بحران اور افسر شاہی سرمائے داری کی ناکامیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ پرانا عالمی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں جارحانہ کارروائیوں میں پے در پے ناکامیوں کے بعد امریکہ شام اور پورے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں نئی جارحانہ کارروائیوں کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔

ایشیا میں جہاں دنیا کی سب سے بڑی آبادی رہتی ہے سامراج اور رجعت کی قوتوں کے خلاف عوامی جدو جہد اور تحریکوں میں تیزی آرہی ہے۔

یہاں بھارتی حکمران خاص طور سے نریندر مودی کی قیادت میں ہندو بنیاد پرست عناصر امریکی سامراج کے ساتھ ساز باز میں شریک ہیں وہیں ہندوستان میں بائیں بازو کی تنظیمیں اپنے آپ کو مستحکم کرتی اور عوام سے جڑتی نظر آرہی ہیں۔

نیپال میں کمیونسٹوں نے دس سال عوامی جنگ کے بعد جمہوری جدو جہد کی قیادت سنبھالی ہے۔ بادشاہت کے خاتمے کے بعد، بھارتی توسیع پسندوں اور سامراج کی تمام تر مداخلت اور دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے وہ ایک متفقہ جمہوری آئین دینے میں کامیاب ہوئی ہیں اور اب دو بڑی کمیونسٹ پارٹیوں کے انضمام سے کمیونسٹ پارٹی آف نیپال ایک نئے عزم اور قوت کے ساتھ اپنے ٹھوس حالات کے مطابق سوشلزم کی تعمیر کا سفر شروع کر رہی ہے۔

فلپائن میں 45 سال سے نامساعد حالات، سامراج کی براہ راست اور بلواسطہ مداخلت کے باوجود کمیونسٹ پارٹی نے اپنی تنظیم اور جدو جہد کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ وہ نئی کامیابیاں حاصل کر رہی ہے۔ آج کامریڈ جوزماریہ سیسن کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی فلپائن انتہائی با اثر سیاسی قوت بن کر ابھر رہی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف پیرو نے سامراج اور مقامی رجعت کے ہاتھوں بہت زیادہ زخم کھانے اور اسکے قائد پروفیسر گزمین (گنزالو) کے سزائے عمر قید اور سینکڑوں ساتھیوں کی شہادت کے بعد بھی نہ صرف خود کو برقرار رکھا بلکہ نامساعد حالات میں نئی حکمت عملی اختیار کر کے اب اپنی صفوں کو از سر نو منظم کر رہی ہے۔

وینز ویلا سمیت لاطینی امریکہ کے آٹھ ممالک میں سامراج مخالف تحریکوں کو پذیرائی ملی۔ ان ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی انقلابی راہ کو برقرار رکھتے ہوئے سامراج مخالف تحریکوں سے تعاون کیا۔ حال ہی میں وینز ویلا میں امریکی سامراج کی تمام تر کاوشوں کے باوجود سوشلسٹ رجحانات کے حامل صدر ماڈورو نے دوسری مدت کے لئے صدارتی انتخابات میں کامیابی حاصل کر لی۔

علاوہ ازیں یورپ اور خود امریکہ میں مارکس اور مارکسزم کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے جس کا اعتراف مغرب کا میڈیا بھی کرتا ہے۔

خود امریکہ کے اندر جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک مارکسی تنظیموں کا از سر نو ابھار دیکھا جاسکتا ہے۔ ان تمام علاقوں میں انقلابی گروہ اور کمیونسٹ کلیکٹوز ہمیشہ سے زیادہ سرگرم ہیں جو بالآخر باہمی اتحاد کے ساتھ ایک مارکسی لیننی سیاسی جماعت میں منظم ہونے کا واضح پروگرام رکھتے ہیں۔

آج بین الاقوامی صورتحال کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ کمیونسٹ تحریک ایک بار پھر نئے جوش وجذبے کے ساتھ ابھر رہی ہے۔

☆☆☆

انتخابی سیاست اور بایاں بازو

اثر امام

بائیں بازو کے انقلابی کارکنان اور پارٹیوں کو انتخابی سیاست کرنی چاہیے یا نہیں؟ انتخابی سیاست ہر درد کا درماں ہے یا نہیں؟ وغیرہ جیسے سوالات پر خود بائیں بازو کے سیاسی کارکنان کی سمجھ بھی واضح اور ایک جیسی نہیں ہے۔ کچھ بہت پرانے سیاسی کارکن بھی اس خیال کے ہیں کہ انتخابی سیاست مارکسی تعلیمات کے برعکس ہوتی ہے۔ یہ کام وڈیروں اور سرمایہ داروں کے سپرد کر دینا چاہیے۔ ہم انقلابی لوگ ہیں اس لیے ہم تو انقلاب ہی کریں گے۔ پتہ نہیں ایسے لوگوں کے پاس انقلاب کا تصور کیا ہے؟ بہرحال یہ تصور مارکسی تعلیمات کے مطابق تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔ بائیں بازو کی انقلابی سیاست سے جڑے ہوئے کارکنان کا ایک حلقہ ایسا بھی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ الیکشن میں ملنے والی کامیابی ہی سارے دکھوں سے جان چھڑانے کا واحد راستہ ہے۔ ووٹ ہی کے ذریعے تبدیلی آسکتی ہے۔ ووٹ ہی کے ذریعے سماجی انقلاب کیا جاسکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ انتخابی سیاست کی جانب مذکورہ بالا دونوں رویے غیر مارکسی اور نامعقول ہیں۔ دنیا کی انقلابی سیاسی پارٹیوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انتخابی سیاست، کچھ مخصوص حالات اور مما لک میں جائز اور ضروری جبکہ کچھ مخصوص مما لک اور مواقع پر ناجائز تھی۔ کبھی کبھی انتخابی سیاست کرنا لازم بن جاتا ہے جیسے ہمارے ملک کی موجودہ صورتحال میں۔ جہاں پر عوام روایتی حکمران سیاسی جماعتوں کا متبادل دیکھنا چاہتا ہے لیکن اسکو متبادل کے طور پر تحریکِ انصاف اور گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس دکھایا جارہا ہے جو کسی بھی صورت حقیقی متبادل نہیں ہیں۔ بعض مواقع پر انتخابی سیاست کرنا انقلاب دشمنی اور اصلاح پرستی کے راستوں پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دور میں کامریڈ لینن کی بالشویک پارٹی نے روس کی اسمبلی (دوما) کے انتخابات میں حصہ لیا تھا جبکہ دوسرے دور میں وہی پارٹی انتخابات میں حصہ لینے سے صریحاً منکر ہوئی۔

قصہ یہ ہے کہ سماجی انقلاب ہمیشہ عوامی بغاوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب تک عوام بغاوت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں یعنی جب تک عوام انکار نہ کر دیں، جب تک عوام نفی نہیں کرتا، روایتی حکمرانوں کے ان تمام ہتھکنڈوں اور طریقہ کار کو تسلیم کرنے سے، جب تک عوام حکمرانوں کے سارے حربوں اور شاطرانہ چالاکیوں کو پہچان کر ان کے ہاتھوں یرغمال ہونے سے انکار نہیں کرتے' اس وقت تک انقلاب محض ایک خواب ہی بنا رہے گا۔ اگر عوام مسلم لیگ نواز سے تو بیزار ہے لیکن تحریکِ انصاف کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا ہے، پیپلز پارٹی سے تو متنفر ہے لیکن اسکا متبادل گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس کی صورت میں ڈھونڈتا ہے تو پھر اسکا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی انقلابی صورتحال نے جنم نہیں لیا۔ لیکن اگر عوام ان ساری روایتی حکمران سیاسی جماعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے تو پھر سمجھنا چاہیے کہ اب حالات انقلابی ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کوئی قابل اور مضبوط انقلابی پارٹی بھی موجود ہو جو عوام کی انقلابی جدوجہد کی رہنمائی کر سکے تو انقلاب یقینی بن جاتا ہے۔ ایسی پارٹی کو ووٹ ووٹ کھیلنے کی بجائے ووٹوں کا بائیکاٹ کر کے براہ راست عوامی بغاوت کو مہمیز دے کر انقلاب کر دینا چاہیے۔ لیکن اگر ایسے حالات نہیں ہیں، اگر عوام کو اب بھی امید ہے کہ شاید "الف" کی بجائے "ب" کو ووٹ دے کر وہ اپنی تقدیر سنوار لینگے تو پھر بائیں بازو کی انقلابی سیاسی جماعتوں کو بھی ضرور انتخابی عمل کا حصہ بننا چاہیے۔ اس لیے بھی تاکہ عوام کو یہ دکھایا جاسکے کہ موجودہ استحصالی نظام کے رہتے ہوئے آپ کی قسمت کبھی نہیں بدل سکتی۔ خواہ آپ معدودے چند اچھے لوگوں کو منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیج بھی دیں۔ حتیٰ کہ کچھ معاملات میں تو آپ ایسے اچھے لوگوں کی چاہے اچھی خاصی تعداد کو منتخب کر کے اسمبلیوں تک پہنچا دیں لیکن چونکہ نظام وہی پرانا قائم ہے جس میں اقتدار کی ڈوریاں کبھی بھی عوامی نمائندوں کے حوالے نہیں کی جاتی ہیں۔ اس لیے عوام کی زندگی بہتر نہیں ہوسکتی ہے۔ چنانچہ انقلابی سیاسی حلقوں کی طرف سے انتخابی سیاست میں حصہ لینا ایک لحاظ سے اس لیے بھی ہوتا ہے تاکہ عوام کو سرمایہ دارانہ جمہوریت اور انتخابی عمل ہی سے دلبرداشتہ کیا جاسکے۔ انتخابی عمل میں شریک ہونے کا دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے انقلابی سیاسی منشور کو عوام تک پہنچایا جا سکے۔ چونکہ انتخابات کی گہما گہمی کا عمل ایسا ہوتا ہے جس میں عوام الناس سیاسی حوالے سے خود بہ خود بہت پرجوش ہوتے ہیں۔ ان کو ہر طرف سے بہت سی باتیں بتائی جاتی ہیں اور وہ خود بھی بہت زیادہ سننے کو تیار ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے ماحول میں ضروری ہوتا ہے کہ انقلابی حلقے بھی انکو اپنی باتیں بتائیں۔ انتخابات کا موسم عوام تک حقیقی عوامی منشور پہنچانے کا ایک سنہری موقع ہوتا ہے۔

کیونکہ عام حالات میں آپ کو ایسا ماحول خود ساختہ طور پر بنانا پڑتا ہے جس میں سیاسی بات چیت کی جا سکے۔ ایسا ماحول جس میں آپ لوگوں کو اپنا منشور سمجھا سکیں۔ کیونکہ ان حالات میں عوام کا سیاسی بات چیت سننے کا کوئی موڈ ہی نہیں ہوتا۔ لیکن انتخابات کے دن ایسے ہوتے ہیں جن میں لوگ پہلے سے ہی سننے کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ اس لیے انقلابی سیاسی حلقوں کو انتخابات میں اسی لیے بھی حصہ لینا چاہیے تا کہ وہ عوام تک ایسے ماحول میں اپنی بات پہنچا سکیں جس دور میں وہ خود بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلابی سیاست کرنے والے حلقوں کے لیے الیکشن سے جڑنے کا سب سے اہم اور بنیادی مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ یعنی الیکشن کے ذریعے عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنا۔ عوام کو اپنے آپ سے جوڑنا۔ الیکشن میں حصہ لینے کا تیسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حجت تمام کی جائے کل کوئی یہ نہ کہے کہ اگر آپ الیکشن میں حصہ لیتے تو ہم آپ کو ووٹ دیکر کامیاب کرنے والے تھے لیکن چونکہ آپ الیکشن میں کھڑے ہی نہ ہوئے اس لیے مجبوراً ہم نے وڈیروں اور سرمایہ داروں کو ووٹ دیا۔ اس کے علاوہ اگر انقلابی امیدواروں میں سے ایک آدھ بندہ جیت جاتا ہے تو ہم ان کے ذریعے عوام کو ایک نمونہ بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر آپ لوگ ہم پر اعتماد کریں، صرف انتخابات ہی میں نہیں بلکہ تمام معاملات میں ہمیں قیادت کرسکنے کا اہل سمجھیں، یہاں تک کہ ہم نظام کی جس انقلابی تبدیلی کی بات کر رہے ہیں اس میں بھی ہمیں حق بجانب سمجھیں تو ہم آپکو اس طرح کا سماج بنا کر دینگے۔ ہم ایسی حکمرانی قائم کر کے دکھائیں گے جو ہمارے ایک دو منتخب نمائندوں کی صورت میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کی طرح بعض ریاستوں میں حکومت بنا لیتے ہیں تو وہ بھی ایک نمونہ ہوتا ہے۔ یہ دکھانے کے لیے کہ اگر ہم تری پورہ، کیرالہ یا مغربی بنگال میں اس طرح حکومت کر رہے ہیں تو کیا بہتر نہیں ہے کہ ہمیں ایسی حکومت سارے ہندوستان پر قائم کرنے دی جائے؟ اگر عوام ہمارے چھوٹے پیمانے کی حکمرانی کے ماڈل سے مطمئن ہونگے تو وہ ضرور بڑے پیمانے پر بھی ہماری حکومت کے حق میں ہونگے۔ اس لیے لے دے کر بات یہاں پہنچتی ہے کہ انتخابی سیاست کرنے والے بائیں بازو کے کارکن کبھی بھی نہیں بھولتے کہ الیکشن جیتنا ان کے لیے پہلا اور آخری مقصد نہیں ہوتا جس طرح حکمران سیاسی پارٹیوں کا منشور اور مقصد صرف الیکشن میں فتحیاب ہونا ہوتا ہے انقلابیوں کا طریقِ کار ایسا نہیں ہوتا ہے۔ یقیناً وہ بھی جیتنے کے لیے انتخابات میں حصہ لیتے ہیں لیکن اسکا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہر حال میں، کسی بھی قیمت پر جیتنا ہے۔ جس طرح سندھ میں جی۔ ڈی۔ اے، ایم کیو ایم اور ایم ایم اے کے ساتھ اتحاد کر کے، سارے پرانے وڈیروں کو ساتھ ملا کر، جو خود بھی بہت عرصے تک حکمران رہ چکے ہیں، انقلاب کرنا چاہتی ہے۔ ہر قسم کے اتحاد اور سیٹ ایڈجسٹمنٹ کا سہارا لیتے ہوئے صرف جیت پر نظر رکھنے والوں کا اسکے علاوہ اور کوئی منشور نہیں ہوتا وہ تو بس یہی چاہتے ہیں کہ جلد از جلد انتخابات کا مرحلہ مکمل ہو اور انہوں نے انتخابات میں جو سرمایہ کاری کی ہے وہ سود سمیت واپس لیں۔ اسکے برعکس انقلابی سیاسی حلقے جیتنا تو چاہتے ہیں لیکن اپنی شرائط پر۔ مخالفین یا سیاست ہی کے دشمنوں سے اتحاد کر کے یا ان کے آشیرواد سے جیت کر وہ اپنی سیاست اور نظریات کو سولی پہ چڑھانا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے انتخابی سیاست کا حصہ بننے والے ہمارے سارے انقلابی ساتھی اس بات کا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ وہ خود کو متبادل کے طور پر پیش کر رہے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ وہی حقیقی متبادل ہیں۔ اس لیے اگر وہ الیکشن میں کامیاب ہونے یا قابلِ ذکر ووٹ لیکر ہارنے کے لیے کسی بھی فرد، پارٹی یا گروہ سے اتحاد کرتے ہیں، جھوٹ، فریب اور دو نمبری چالیں استعمال کرنے کو جائز سمجھتے ہیں اور عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ انتخابی سیاست کے اپنے رنگ ڈھنگ اور اپنی مخصوص ضرورتیں ہوتی ہیں، اگر انقلابی لوگ بھی مقصد برآری کیلئے وہ سب کچھ کرنا شروع کر دیں جو روایتی حکمران سیاسی جماعتیں کرتی رہتی ہیں تو پھر دائیں، بائیں، انقلابی، ردِ انقلابی، ترقی پسند، رجعت پرست، وغیرہ وغیرہ کا فرق بالآخر کیسے پتہ لگے گا سیاست کو منافع بخش کاروبار سمجھنے والوں اور ان کا متبادل ہونے کے دعویداروں میں کیا فرق رہ جائے گا؟ اس صورت میں ہمیں کم از کم متبادل کہلوانے کا حق تو ہرگز نہیں ہوگا۔ ہمارے کچھ انتہا پسند انقلابی ساتھیوں کا خیال ہے کہ یا تو ہمیں سرمایہ دارانہ جمہوریت کی تمام تر قباحتوں کو اپناتے ہوئے انتخابی سیاست کا حصہ بننا پڑے گا یا پھر ہم انتخابات کے جھمیلے میں پڑیں ہی نہیں زیرِ نظر مضمون اس بات کو ذہن نشین رکھتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اسکے بیچ کا راستہ بھی موجود ہے یعنی انتخابی عمل کا حصہ بھی بنا جائے اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کی قباحتوں سے بھی پہلوتہی کیجائے آخری بات یہ کہ اگر ہر طرح کی سیٹ ایڈجسٹمنٹ اور انتخابی اتحادوں کے سارے حربے استعمال کرنے کے بعد بھی خدانخواستہ ہمیں کامیابی نہیں ملتی تو پھر ہماری حالت تو سندھی زبان کی اس کہاوت کی طرح ہو جائے گی کہ:

کتا بھی کھایا، پیٹ بھی نہ بھرا۔

تعلیمی نصاب: نیا تنازعہ

ڈاکٹر ریاض شیخ

پاکستان ایک وفاق ہے اور ایک وفاقی ریاست اختیارات کو اپنی وفاقی اکائیوں کو منتقل کر کے ہی اپنے انتظامی امور چلاتی ہے بدقسمتی سے پاکستان ایک طویل عرصے تک غیر جمہوری نظام کے تحت چلتا رہا اور پھر مزید یہ کہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب موجودہ پاکستان کے صوبوں کی صوبائی حیثیت اور شناخت کا خاتمہ کر کے ون یونٹ کا قیام عمل میں لایا گیا چھوٹے صوبے اس زیادتی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے بالآخر ۱۹۷۰ء میں ون یونٹ کے خاتمے اور ۱۹۷۳ء میں محدود پیمانے پر صوبائی خودمختاری کی بحالی دیکھنے کو ملی ہے ۱۹۸۳ء میں مزید وسیع کیا جانا تھا جو کہ بدقسمتی سے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد نہ ہو سکی لیکن ۲۰۰۶ میں محترمہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف سمیت کئی سیاسی جماعتوں کی حمایت سے معاہدہ جمہوریت (چارٹر آف ڈیموکریسی) میں ایک بار پھر صوبائی خودمختاری کی بات کی گئی۔ ۲۰۰۸ء میں پی پی پی کی حکومت نے اٹھارویں ترمیم متعارف کرائی یقیناً یہ ایک بہت بڑا اقدام تھا جہاں اس ترمیم کے دیگر اثرات تھے وہاں ایک اہم مرحلہ وفاق کے پاس کام کرنے والی کئی وزارتوں کو صوبوں کی منتقلی بھی شامل تھی دیگر کئی وزارتوں کے ساتھ وزارت تعلیم کا بھی وفاق میں خاتمہ کر کے اسے صوبوں کو منتقل کر دیا گیا یہ بڑی دوررس تبدیلی تھی اس کے تحت صوبوں کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے صوبے میں تعلیم کا مکمل نظم ونسق سنبھال لیں اس کا سب سے اہم پہلو یہ بھی ہے کہ صوبوں کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ اپنے صوبوں میں قائم اسکولوں میں اپنا نصاب خود نافذ کریں ۲۰۰۹ء میں وفاقی حکومت نے آخری تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا اور اس کے بعد یہ ذمہ داری صوبوں کے حوالے کر دی گئی۔

صوبوں نے ۲۰۱۰ء کے بعد آہستہ آہستہ کام شروع کیا یقیناً یہ ایک مشکل مرحلہ تھا کیونکہ چھ دہائیوں کے عرصے تک صوبائی حکومت تقریباً مفلوج رہی تھیں اور انہیں وفاقی حکومت کی منظور شدہ پالیسی پر من وعن عمل کرنا ہوتا تھا لیکن تمام تر مشکلات کے باوجود صوبوں نے بہر حال کام شروع کیا لیکن زیادہ تیزی سے کام ۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۳ء کے بعد دیکھنے میں آیا۔ صوبائی حکومت نے اپنے صوبے میں اسکولوں میں نصاب کا جائزہ لینے اور ان میں تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا چونکہ ۲۰۱۳ء میں مختلف صوبوں میں مختلف سیاسی جماعتوں کی حکومتیں بنی تھیں اس لیے ہر صوبے میں مختلف رجحانات دیکھنے کو ملے مثلاً پنجاب میں ن لیگ سے تعلق رکھنے والی حکومت تھی جو کہ کسی حد تک دائیں بازو کی حکومت شمار ہوتی ہے جبکہ سندھ اور بلوچستان میں نسبتاً روشن خیال صوبائی حکومتیں بنی تھیں یعنی پی پی سندھ اور نیشنل پارٹی اور اس کے اتحادیوں نے ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کی قیادت میں صوبائی حکومت تشکیل دی لیکن سب سے زیادہ سنگین صورت حال خیبر پختونخوا میں دیکھنے کو ملی جہاں پی ٹی آئی نے جماعت اسلامی جیسی انتہائی دائیں بازو کی جماعت کے ساتھ مل کر نہ صرف اتحادی حکومت بنائی بلکہ تعلیم کی وزارت بھی جماعت اسلامی کے حوالے کر دی تین صوبوں نے اپنے نصاب میں بڑی حد تک تبدیلی کی اور اسے عصر حاضر کی ضروریات کے عین مطابق لانے کے لیے منصوبہ بندی کی جبکہ خیبر پختونخوا نے نصاب کو مزید اسلامی بنانے کی کوشش کیں۔ خصوصاً بلوچستان اور سندھ میں نصاب کی تبدیلی کے لیے بھرپور کام کیا گیا جبکہ نواز شریف کی سوچ میں نمایاں تبدیلی کے باعث پنجاب کے نصاب سازی کے عمل میں بھی مثبت تبدیلی دیکھنے کو ملی سندھ میں سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ اور صوبائی محکمہ تعلیم کے نصابی ونگ نے برٹش کونسل کے ساتھ مل کر نصاب میں ضروری تبدیلی کے

مختلف شعبوں کے ماہرین کی نگرانی میں نافذ نصاب کا جائزہ لینے اور اس میں ضروری تبدیلیاں کرنے کے لیے کمیٹی قائم کی بین الاقوامی شہرت کی حامل پروفیسر ڈاکٹر برینڈ ڈین کو اس کے لیے مرکزی ذمہ داری سونپی گئی جبکہ دیگر کئی ماہرین کو بھی اس میں شامل کیا گیا راقم کو بھی اس کمیٹی میں کام کرنے کا موقع ملا کمیٹی کی سفارشات پر نصاب سے نفرت پر مشتمل مضامین اور دیگر غیر ضروری چیزوں کو حذف کیا گیا اور ان کی جگہ پر سائنسی فکر اور مذہبی ہم آہنگی کے فلسفے کے تحت ایسے مضامین کو شامل کیا گیا جن کے ذریعے بچوں میں ابتدا ہی سے برداشت اور عدم تشدد کے رجحانات کو فروغ دیا جاسکے بچوں کو انہیں تاریخ' جغرافیہ اور ثقافت کے بارے میں علم فراہم کرنے کی کوشش کی جنسی تفریق کو ختم کرنے اور تمام شہریوں کو مذہب' نسل اور فرقے سے بالاتر ہو کر دیکھنے کی تعلیم دینے کا نظریہ متعارف ہوا تمام مذاہب' فرقوں اور گروہوں کے مذہب' ان کی مذہبی رسومات اور مذہبی عبادت گاہوں کے احترام کے عمل کو یقینی بنانے کے لیے نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی گئیں ساتھ ہی ساتھ اس عمل کے لیے اساتذہ کی تربیت اور آگہی و شعور بڑھانے کے لیے بھی تربیتی عمل شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔

لیکن یہ عمل اتنا آسان اور سہل نہ تھا کچھ مذہبی جماعتوں نے نصاب میں متعارف کرائی جانے والی ان تبدیلیوں پر نہ صرف اپنے تحفظات کا اظہار کیا بلکہ دھونس دھمکی پر اتر آئے اور کمیٹی کے اراکین کے خلاف زہر اگلا خصوصاً ڈاکٹر ڈین جو کہ مسیحی تھیں انہیں ہدف بنایا گیا ان کے خلاف احتجاج کیے گئے جلسے جلوس نکالے گئے احتجاجی بینرز لگائے گئے اور شدید دھمکیاں دی گئیں جس کے باعث ڈاکٹر ڈین کو ملک چھوڑنا پڑا یقیناً یہ ایک انتہائی تکلیف دہ صورت حال تھی لیکن تمام تر مشکلات کے باوجود نصاب میں ضروری تبدیلی اور بہتری لانے کا عمل جاری ہے یقیناً اس سلسلے میں کئی مذہبی جماعتوں اور دیگر گروہوں کی جانب سے مزاحمت کا بھی سامنا ہے۔

اس گمبھیر اور مشکل صورت حال میں ایک نئی تکلیف دہ اطلاع گزشتہ ہفتہ اس وقت آئی جب وفاقی کابینہ کے اجلاس کے بعد وفاقی وزیر اطلاعات چودھری فواد حسین نے اپنی ایک پریس کانفرنس بریفنگ کے دوران صحافیوں کو بتایا کہ وفاقی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ نصاب سازی کے متعلق صوبائی اختیارات کو کم کیا جائے گا اور وفاقی حکومت نے تمام صوبوں میں یکساں نصاب نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ان کے خیال میں اس طرح یکساں نصاب نافذ کرنے سے قومی اتحاد کو مزید فروغ ملے گا اس موقع پر جب صحافیوں نے وفاقی وزیر کی توجہ اٹھارویں ترمیم اور اس کے تحت صوبائی حکومتوں کو حاصل اختیارات کی طرف مبذول کرائی تو موصوف نے بڑے غیر سنجیدہ انداز میں یہ بات کہی کہ تین صوبوں میں تو پہلے ہی ہماری حکومت ہے جبکہ سندھ میں صرف پی پی پی کی حکومت ہے اس لیے ہمیں اس میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئے گی ہم باہمی صلاح و مشورے سے اس مسئلے کو حل کرلیں گے ان کے بیان سے یہ بات عیاں تھی کہ نصاب کو ایک بار پھر مرکزی حکومت کے حوالے کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

یہ بات ہم سب کے علم میں ہے کہ اٹھارویں ترمیم کے منظور ہونے کے بعد سے مسلسل اس ترمیم کے خلاف پروپگنڈہ ہوتا رہا ہے کہ کچھ قوتیں اس کو شیخ مجیب کے چھ نکات سے بھی زیادہ خطرناک اور وفاق کو کمزور کرنے کے مترادف قرار دے چکی ہیں انہوں نے جہاں اس ترمیم کے دیگر معاملات پر تنقید کی ہے وہیں نصاب کو صوبوں کے حوالے کرنے کو بھی بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا ہے ان کا خیال ہے کہ تمام صوبوں میں یکساں نصاب پڑھایا جانا چاہیے۔ پاکستان میں یکسانیت کی اس پالیسی نے صوبوں اور مختلف قومیتوں میں احساس محرومی کو فروغ دیا ہے جبکہ دوسری طرف جنرل ضیا کی جہادی پالیسیوں کے نتیجے میں درسگاہوں اس کے نصاب اور اساتذہ کو انتہا پسند پیدا کرنے کے لیے ایک نرسری کے طور پر استعمال کیا گیا اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں روشن خیالی' منطق اور سائنسی فکر کو فروغ دینے کے بجائے مذہبی منافرت فرقہ بندی اور مذہبی جنون کو فروغ دیا گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا

کہ نہ صرف مدرسوں بلکہ ملک کی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں سے بھی وہ طالب علم سامنے آئے جنہوں نے دہشت گردی میں حصہ لیا۔صفورہ گوٹھ میں اسماعیلی مسلمانوں پر حملے سے لے کر سبین محمود کے قتل جیسے واقعات میں ملک کے ممتاز تعلیمی اداروں کے طلبا شامل تھے جس کی ایک بنیاد وہ ذہنیت ہے جو کہ ان درسگاہوں میں تیار کی گئی اور اس میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ وہاں کا نصاب بھی ہے۔

دنیا کے تمام وفاقی ممالک میں صوبائی اکائیوں کو بڑے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ اس کے تحت اپنے نصاب کو بھی ترتیب دیتے ہیں ہندوستان اس کی اعلیٰ مثال ہے جنوبی ہندوستان کی ریاستیں مثلاً تامل ناڈو' کیرالہ' کرناٹک' آندھرا پردیش وغیرہ شمالی ہندوستانی صوبوں مثلاً اتر پردیش' بہار' ہریانہ پنجاب وغیرہ سے بالکل مختلف سیاسی سماجی اور ثقافی تاریخ رکھتی ہیں اور اپنے ہاں اپنی مقامی ضروریات کے تحت نصاب پڑھاتی ہیں لیکن ان تمام تر فرق کے باجود ہندوستان کی وفاقیت اور سلمیت پر کوئی فرق نہیں پڑا اسی طرح مغربی بنگال کا جو سماجی ڈھانچہ مشرقی ریاستوں مثلاً گجرات راجھستان اور مہاراشٹر (ممبئی) سے بالکل مختلف ہے لیکن اس تفریق کو ایک مثبت قوت سے اس طرح بدلا گیا ہے کہ شہریوں کو کسی محرومی کا احساس دلائے بنا ان کو اپنے فیصلے کرنے کا اختیار دیا گیا اس سے وفاقیت کو مزید مستحکم ہونے کا موقع ملا۔

اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ نصاب کو صوبوں سے لے کر دوبارہ وفاق کے حوالے کرنے کی بات کوئی اچھی تجویز نہیں ہوگی اس سے صوبوں اور وفاق کے درمیان مزید غلط فہمیاں پھیلیں گی یہ صوبائی خودمختاری کی نہ صرف نفی ہوگی بلکہ کچھ قوتوں کے زیر اثر کیے جانے والے فیصلے دوبارہ وفاقیت کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہوں۔

☆☆

رسالہ عوامی جمہوریت

شاہ محمد مری

کسی بھی سماج میں ''تعلیم اور اُس کے نظام'' کے بارے میں حساسیت پایا جانا قدرتی امر ہے۔مگر پاکستان جیسے ترقی پذیر سرمایہ دار ملکوں میں حکومتیں بالکل ایسا نہیں کرتیں۔تعلیم ترجیح ہی نہیں ہے۔وگرنہ کسی بھی سال کا سرکاری بجٹ دیکھیں (وفاقی بھی اور صوبائی بھی) تو پورے نظام سے نفرت ہونے لگتی ہے۔اندرونی بجٹ کو تو چھوڑیے بیرونی دنیا سے تعلیم کے نام پہ جو پیسہ وغیرہ ملتا ہے اُس کو بھی انتہائی بے دردی سے، اور فضول باتوں پہ خرچ کیا جاتا ہے۔لاحاصل لمبی چوڑی بڑی بڑی اور مہنگی مہنگی بحثیں ہوتی ہیں، اپنے عزیزوں دوستوں میں سے تعینات کردہ کمیشن و ماہرین نام کی بے شرف چیزیں تخلیق کی جاتی ہیں۔تعلیم کا نام استعمال کر کے اپنے سینئرز کی بیگمات کے لیے شاپنگ کا واحد مقصد لے کر بین الاقوامی دورے اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔

اس بد بخت دھندے میں نہ تو تعلیم کا اور نہ ہی عوام الناس کا کوئی فائدہ ہونا تھا۔بس پیسہ ریت میں چھڑکنا تھا۔نام حب الوطنی کا تھا، ضیاء الحقی سیاسی مذہب کا تھا۔بے درد نظام کا بے درد معاشرہ۔

ون یونٹ بنا، ٹوٹا۔صوبے بنے حاکمیت ملی، کرتوت نہ بدلے۔حتی کہ ابھی حال میں آئین میں اٹھارویں آئینی ترمیم ہوئی۔اور سترہ محکمے فیڈریشن سے لے کر صوبوں کے حوالے کر دیے گئے۔ان میں تعلیم کا محکمہ بھی شامل ہے۔

اس اہم آئینی ترمیم کو پانچ سال ہونے کو ہیں مگر ابھی تک صوبائی حکومتوں نے کوئی تعلیمی پالیسی مرتب نہیں کی ہے۔یہی حال ہمارے ہاں تعلیم سے متعلق این جی اوز، سیاسی پارٹیوں حتی کہ طلبا تنظیموں کی بھی ہے۔آج تک کسی نے تعلیم اور اس کے نظام جیسے بنیادی معاملے پر کوئی سمینار، کانفرنس اور

نشست منعقد نہ کی۔ نہ کوئی قرارداد، مضمون یا پمفلٹ لکھا۔

سنگت اکیڈمی آف سائنسز (پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن بلوچستان) نے سال بھر کی محنت اور ماہرین کی بے شمار میٹنگوں اور ڈیلی بریشنز کے بعد ایک ''عوامی متبادل ایجوکیشن پالیسی'' مرتب کی۔ کتابچہ کی صورت اُسے چھاپا اور سیاسی پارٹیوں، تعلیمی اداروں، طلبا تنظیموں، اور مزدور یونینوں کو بھیجا۔ مگر ابھی تک صورتحال جوں کی توں ہے۔

فریم اور چوکھٹا مرتب ہوجائے تو باقی معاملات ذرا آسان ہوجاتے ہیں۔ تعلیم کے مین آبجیکٹوز Main objective کے بارے میں 8 اگست 1970 کے ''عوامی جمہوریت'' نے ایک پورے صفحہ کا مضمون دیا۔ جیسے کنجی مل جائے معاملے کی۔

اس مضمون کے اندر بنیادی بات یہ کی گئی کہ جب تک تعلیم کے مقاصد مقرر نہیں کیے جاتے اُس وقت تک نصابِ تعلیم اور نظام تعلیم میں کوئی بامقصد تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ اُس بارے میں اصل بات یہ طے کرنے کی ہے کہ ''سماج کی معاشی ترقی کے تقاضے کیا ہیں اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اُس میں کس قسم کے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی ضرورت ہے۔ ۔۔اور پھر سماجی سائنس کے کسی طالب علم کو یہ ''الف بے'' تو ازبر کرنا ہی چاہیے کہ ''آئین میں انسانوں کے تعلیم اور روزگار کے حق کو بطور بنیادی حقوق تسلیم کیا جائے''۔ (محققوں اور سیاسی کارکنوں کو دوربینیں لے کر سیاسی پارٹیوں کے منشور میں یہ فقرہ ڈھونڈنا ہوگا)۔

تعلیم کا ایک ہی مقصد ہے کہ وہ سماج کی معاشی ترقی اور نشوونما میں کام آئے۔ اور یہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم ہے۔ جہاں تعصّبات کے گڑھے نہ ہوں اور روشنی اور بلند نظری کی دنیا ہو۔

عوامی جمہوریت کے اسی شمارے میں ایک اور نظریاتی معاملہ کو سلجھا دیا۔ ایک غلط العام تصور سماج میں بالعموم، اور دانشوروں میں بالخصوص موجود ہے۔ یہ کم بخت کنفیوژن کسی صورت ختم ہی نہیں ہوتا۔ وہ تصور یہ ہے کہ ''عوام کے روٹی روزگار کے معاملات آمریت کی وجہ سے ہیں''۔ گویا ساری مشکلات آمر اور آمریت نے پیدا کی ہیں۔ ہمارے دانشور (جن کی اکثریت بورژوا دانشوروں کی ہے) کبھی بھی عوام کو نہیں بتاتے کہ غریب اور محنت کش عوام الناس کی مشکلات اور سماج کی غلاظتیں سامراجی اثرات اور جاگیرداری سرمایہ داری نظام کی وجہ سے ہیں۔

ہم 1970 کی بات کر رہے ہیں اور اُس بڑے کنفیوژن کی بات کر رہے ہیں جو پورے پچاس سال سے موجود ہے۔ آیئے ہم 1970 ہی کی بات کریں، آج سے ٹھیک 50 برس قبل کی۔ اُس وقت (اور بڑی حد تک آج بھی) ''بڑے بڑے'' دانشور اِس ایک فقرے کے طوطے بنے ہوئے تھے:

''پاکستان پیپلز پارٹی لیفٹ پارٹی ہے اور مسٹر بھٹو سوشلسٹ ہے''۔

عوامی جمہوریت نے اُسی وقت لکھا کہ یہ دونوں باتیں حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ ''نہ پاکستان پیپلز پارٹی لیفٹ ہے اور نہ مسٹر بھٹو سوشلسٹ ہے''۔ فقرے باز اور نعرے باز تو دلیل وغیرہ تک جانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے مگر سی آر اسلم نچلے طبقے کے عوام سے مخاطب تھا:

> ''یہاں کسی پارٹی کے لیفٹ ہونے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ پاکستان سے سامراج کی معاشی گرفت سے نجات حاصل کرنے کے لیے سامراجی سرمائے کی ضبطی کا مطالبہ کرے۔ پیپلز پارٹی کے منشور میں اور اس کے لیڈر کی کسی کتاب یا تقریر میں اس کا بھولے سے بھی ذکر نہیں ہے۔ بھٹو سوشلسٹ نہیں ہے اس لیے کہ اُس نے دھڑا دھڑ جاگیرداروں اور وڈیروں کو اپنی پارٹی میں بھرتی کرلیا ہے''۔

میرا دل کرتا ہے کہ میں نصف صدی بعد ''ہفت روزہ عوامی جمہوریت'' کے 14 اگست 1970 کے فقرے اپنی مکمل تائید کے ساتھ دوبارہ لکھوں اور زور زور سے پڑھوں: ''سچی بات یہ ہے کہ بھٹو کی پارٹی بورژوا پارٹی ہے اور وہ خود ایک بورژوا لیڈر ہے۔ اس کو اور اُس کی پارٹی کو سوشلسٹ تو، نام نہاد بائیں بازو کے دانشوروں نے بنا دیا ہے''۔

اسی شمارے میں صفحہ آٹھ پر سی آر اسلم جنرل سیکریٹری نیپ

پاکستان نے ایک بیان تفصیلی جاری کیا۔ ہم اُس میں سے صرف دو باتوں کا ذکر کریں گے۔ پہلی بات معیشت کی ہے۔ اُس کے نزدیک ''اچھی معیشت امریکی قرضوں کی ضبطی، امریکی سرمائے کی ضبطی، زمین کی حد ملکیت کو محدود کرنے، اور، اجارہ دار صنعتوں کو قومی ملکیت لینے کے پروگرام کے بغیر بے معنی ہے۔ جو شخص اِن اقدامات کے بغیر عوام کی فلاح کا نام لیتا ہے وہ عوام کو دھوکہ دیتا ہے''۔ میں آج اپنے قارئین سے پوچھتا ہوں کہ وہ جن جن لیڈروں پارٹیوں کو ووٹ دیتے ہیں کیا وہ ان چار باتوں کا وعدہ کرتی ہیں؟۔ نہیں؟۔ ارے چھوڑیے پھر انہیں۔

دوسری اہم بات وہ ملک میں عام انتخابات کا کرتا ہے ۔۔۔ ''انتخابات کو پارٹی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھتی اور اسی لیے محض انتخابات کی خاطر وہ نہ تو اپنے پروگرام سے انحراف کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لیے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کرتی ہے۔

''پارٹی انتخابات میں صرف اس لیے حصہ لے رہی ہے کہ الیکشن کے اس دور میں عملی سیاست میں شامل ہو کر عوامی مطالبات کو لوگوں تک پہنچائے۔ لیکن وہ عوامی جدوجہد کے سیدھے راستے کو ساتھ ساتھ استعمال کرتی رہے گی۔

13 ستمبر 1970 کے شمارے میں اخبار کے مالی بحران کا تذکرہ کرتے ہوئے اور قارئین وخریداروں سے بقایاجات کی ادائیگی کی یاددہانی کرتے ہوئے اخبار کی مالی حالت کے لیے ایک دلچسپ لفظ استعمال کیا گیا: ''عوامی جمہوریت مالی مشکلات سے ''دم بلب'' ہے۔

اور ہم گواہ ہیں کہ ''عوامی جمہوریت'' مارشل لا کی طرف سے اور بھٹو کی ''جمہوری'' حکومت کی طرف سے تو بند ہو گیا مگر اُن بڑے انسانوں نے پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے اِس سیاسی ونظریاتی جریدے کو بند ہونے نہ دیا۔ سچ ہے کہ فکری رسائل وجرائد کا جاری رہنا اُس کے انتظامیہ کے لیے سب سے بڑا فریضہ ہوتا ہے، سماجی فریضہ۔

***

آپ کو یاد ہوگا کہ 9 دسمبر 1970 ''عوامی جمہوریت'' رسالے سے وابستہ لوگوں کی پارٹی NAP کے سربراہ مولانا بھاشانی نے اعلان کیا کہ وہ بنگلہ دیش بنانے کی تحریک کا ساتھ دینا چاہتا ہے لہذا بقیہ پاکستان سے تعلق توڑنا چاہتا ہے۔ اس لیے اب مزید مشترکہ NAP سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

یہ گویا NAP کے لیے ایک بحران تھی۔ مولانا نے الیکشن وغیرہ سے بھی کنارہ کر لیا۔ اس نے یوں بنگال میں شیخ مجیب کے لیے راستہ صاف کیا۔ مگر مغربی حصے میں NAP کو کنفیوژن کے بھیڑیوں کے غول کے سامنے پھینک دیا۔

اس نئے بحران سے نمٹنے کے لیے 27،26 دسمبر کو مغربی حصہ کے NAP کے لیڈروں کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ مولانا اور مشرقی بازو کی پارٹی کے چلے جانے سے بقیہ پاکستان میں انقلابی پارٹی کی ضرورت ختم نہیں ہوتی۔ چنانچہ نئی صورتحال کے مطابق پارٹی کو سیاسی اور تنظیمی طور پر نئی صورت میں ڈھالنے کے لیے ایک ڈیلی گیٹ کانفرنس ضروری ہوگئی۔ اس ڈیلی گیٹ کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایک پانچ رکنی کمیٹی بنائی گئی جس میں مغربی حصے کے پاکستان کے ہر صوبے سے ایک فرد لیا گیا۔

اس دوران رسالہ اپنی اشاعتوں میں پارٹی بحران اور الیکشن کے نتیجے میں پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کی کامیابی پر اداریے اور مضامین شائع کرتا رہا۔

دوسری طرف ملک میں عام انتخابات ہوتے ہی پاکستان اپنی تاریخ کے سب سے بڑے آئینی بحران میں مبتلا ہوا۔ چاپلوسی کے دلدادہ دانشوروں اور صحافیوں کی جانب سے القابات سے لدے پھندے قائدِ عوام ''(بھٹو) نے چاپلوسی کے دلدادہ دانشوروں اور صحافیوں کی جانب سے القابات سے لدے پھندے ''بنگلہ بندھو'' (مجیب) کی اکثریت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بھٹو کی کیا حیثیت تھی، مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کی اکثریت ماننے سے انکار کر دیا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مغربی پاکستان کی کیا حیثیت تھی، بس فیصلہ کرنے والوں نے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والی

پارٹی کی اسمبلی میں اکثریت کو ماننے سے انکار کر دیا۔

ہم ذرا خانیوال کسان کانفرنس (منعقدہ 23 مارچ 1971) کے لیے وقف اگلے دو شماروں میں اہم ترین نکتہ کی طرف آتے ہیں۔ یہاں بھاشانی کے پیدا کردہ بحران کا حل تلاش کیا گیا تھا۔

اسی کسان کانفرنس کے اختتام پر 23 مارچ کو پارٹی کی ڈیلیگیٹ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اِن تین سو ڈیلیگیٹس نے زبردست غور وخوض کے بعد پارٹی کا نیا نام رکھا: پاکستان سوشلسٹ پارٹی۔ ایک آرگنائزنگ کمیٹی بنائی گئی۔ سی آر اسلم کو اس آرگنائزنگ کمیٹی کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ اس آرگنائزنگ کمیٹی نے کام یہ کرنا تھا کہ وہ پارٹی کا آئین ومنشور تیار کرے، گراس روٹ تک پارٹی کی تنظیم سازی کی نگرانی کرے اور ایک سال بعد پارٹی کی پہلی کانفرنس کے انعقاد کا بندوبست کرے۔

اُدھر، 26 مارچ کو جنرل یحی نے شیخ مجیب کی پارٹی عوامی لیگ کو کالعدم قرار دے دیا اور وہاں فوج پھینک دی۔ اخبار عوامی جمہوریت نے اس سارے بحران کو سیاسی کے ساتھ ساتھ معاشی قرار دیا اور اسے ''سرمایہ دار طبقے کے مختلف علاقائی گروہوں کے تضاد'' کا انجام قرار دیا۔

مگر مجھے سب سے زیادہ دلچسپ یہ بات لگی کہ 8 مئی 1971 کے شمارے میں پاکستان پر قرضوں کی مالیت 5 ارب ڈالر بتائی گئی (آج؟۔)

15 مئی 1971 کے شمارے میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی تنظیمی کمیٹی کی جانب سے پارٹی کا مجوزہ آئین شائع کیا گیا اور اگلے شمارے یعنی 22 مئی 1971ء کو پارٹی کے منشور کا مسودہ بھی چھاپ دیا گیا۔

☆☆☆

جمہوریت اور انتخابات کا کھلواڑ

زبیر رحمٰن

سرمایہ دارانہ نظام کی جمہوریت اور انتخابات کے اعلیٰ نمونے کی امریکہ اور برطانیہ کی اکثر مثالیں دی جاتی ہیں۔ امریکہ میں صدر ٹرمپ جیت گئے۔ امریکہ میں اس وقت ان کو عوام کی حمایت 35 فیصد رہ گئی ہے۔ انھوں نے خواتین کی جس طرح تذلیل اور تحقیر کی ہے اس پر نہ صرف دنیا بھر کی خواتین نے احتجاج کیا بلکہ انکی اپنی بیوی اور بیٹیوں نے بھی احتجاج کیا۔ لاطینی امریکی عوام کی بھی بے رحمانہ تذلیل کی ہے، میکسیکو کی سرحد پر باڑ لگایا جا رہا ہے اور سیکڑوں لاطینی بچوں کو انکے ماؤں سے چھین کر قید میں رکھا گیا ہے۔ امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی کے سوشلسٹ لیڈر برنی سینڈرز جنھوں نے 2020 میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں پھر ایک بار حصہ لینے کا اعلان کیا ہے نے کہا کہ ٹرمپ کالوں، لاطینی، خواتین اور امریکی شہریوں کا دشمن اور ارب پتیوں کا دوست ہے۔ ابھی حال ہی میں برطانیہ کے دورے پر آئے ہوئے ٹرمپ کے خلاف ڈھائی لاکھ افراد نے ایک سو شہروں میں مظاہرے کئے۔ ان پر نچھاور کرنے کے لئے مچھلیوں کی آنتیں عوام میں تقسیم کی گئیں، پھر بھی وہ صدر صاحب ہیں۔

برطانیہ کے حزب اختلاف کی لیبر پارٹی کے سوشلسٹ لیڈر جیری کوربون جب یہ کہتے ہیں کہ ''میں اگر وزیر اعظم بن گیا تو ایٹمی جنگ کا ریموٹ کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے کر جنگ نہیں کرنے دوں گا'' اس پر ردعمل کرتے ہوئے برطانیہ کے چیف آف آرمی اسٹاف نے بیان دیا کہ ''پھر ہم بغاوت کر دینگے'' پھر بھی برطانیہ دنیا کی بہترین جمہوریت کہلاتی ہے۔ یہ ہے سرمایہ دارانہ نظام کی منافقت۔

اب جمہوریت کا ادنیٰ نمونہ پاکستان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اسلام آباد ہائی کورٹ کے محترم جسٹس شوکت عزیز صدیقی اپنے ریمارکس میں آرمی چیف سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ ''آرمی چیف صاحب اپنے لوگوں کو روکیں، عدلیہ میں ججیز کو اپروچ کیا جا رہا ہے۔ ججیز کے فون ٹیپ کئے جاتے ہیں، انکی زندگیاں محفوظ نہیں ہیں۔ عدالت میں حساس ادارے کا نمائندہ پیش ہوا۔ جسٹس صدیقی

نے کہا کہ آپ کے لوگ اپنی مرضی کے بینچ بنوانے کی کوشش کرتے ہیں۔عدالت نے تحریری حکم میں لکھا ہے کہ شہریوں، تاجروں اور بااثر افراد کو اسلام آباد سے اٹھا نا روٹین بن چکی ہے، حساس ادارے اپنی آئینی ذمے داری کو سمجھیں، عدلیہ، ایگزیکٹیو اور دیگر اداروں میں مداخلت کو روکا جائے۔تحریری حکم میں کہا گیا ہے کہ حساس ادارے ملک کے دفاع اور سیکورٹی پر توجہ دیں۔ریاست کے اندر ریاست کا تصور کو ختم کیا جائے۔اگر دیگر اداروں میں مداخلت کو نہ روکا گیا تو فوج اور ریاست کیلئے تباہ کن ہوگا۔جسٹس صدیقی نے تحریری حکم میں لکھا ہے کہ آرمی چیف اس الارمنگ صورتحال کو سمجھیں اور دیگر اداروں میں اپنے لوگوں کو مداخلت سے روکیں۔عدالت نے عدالتی حکم کی کاپی آرمی چیف ڈی جی آئی ایس آئی، سیکریٹری دفاع اور سیکریٹری داخلہ کو پہنچانے کا حکم دے دیا۔عدالت میں پیش کئے گئے ایک بازیاب شخص رب نواز نے بتایا کہ نامعلوم افراد آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے۔ خدا کیلئے ملک پر رحم کریں۔جسٹس صدیقی نے ریمارکس دیے کہ اپنے آپ کو عقل کل مت سمجھیں۔پولیس والے ایجنسیوں کے آگے بے بس ہیں۔عدالت نے اسلام آباد پولیس کے ایس پی انویسٹی گیشن زبیر پر اظہار برہمی کیا۔جسٹس صدیقی نے کہا کہ جو افسر سچ نہ بول سکے اور خوف و مصلحت کا شکار ہو اسے پولیس میں نہیں ہونا چاہیے یہ ہے ترقی پذیر ملکوں میں جمہوریت اور عدلیہ کے کردار کی حیثیت اور دوسرے اداروں کا کردار۔

اسی قسم کی مصلحت ہم ریاست کے بارے میں بھی کرتے آرہے ہیں۔ لوگوں کا مذہب تو ہوتا ہے لیکن ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہیے۔ایک استاد اپنے شاگرد کو جب پڑھاتا ہے یا ڈاکٹر اپنے مریض کا علاج کرتا ہے تو اس پڑھانے اور علاج کرنے کا عمل سیکولر ہوتا ہے۔وہ کسی بھی مذہب کے طلبہ کو درس دیگا اور کسی بھی مذہب کے مریض کا علاج کریگا۔پاکستان کے بانی محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان کا نام ''جمہوریہ پاکستان'' رکھا گیا تھا مگر ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں اسکا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' رکھ دیا گیا۔یہ ایک غیر جمہوری عمل تھا۔دنیا کے بیشتر مسلم ممالک سیکولر ہیں جیسا کہ بنگلہ دیش، نائیجیریا، وسطی ایشیائی ممالک، کوہ قاف کے مسلم ممالک، بلقان کی مسلم ریاستیں، مغربی افریقی مسلم ممالک اور مشرق وسطیٰ کے کئی مسلم ممالک سیکولر ہیں مگر ان ملکوں میں کروڑوں مسلمان بستے ہیں۔حال ہی میں اسرائیل کو یہودی ریاست کے طور پر آئینی منظوری دے دی گئی ہے اس کے حق میں 66 ووٹ پڑے جبکہ مخالفت میں 55 ووٹ پڑے، 3 اراکین نے ووٹ نہیں ڈالے یعنی کہ 62 کے مقابلے میں 55 اراکین کی مخالفت انتہائی قابل تعریف اور قابل مبارک باد کا عمل ہے، ان میں متعدد کمیونسٹ پارٹی آف اسرائیل کے پارلیمنٹ کے اراکین بھی شامل ہیں۔مذہبی ریاستیں دنیا میں چند ہی رہ گئیں ہیں۔عرب بادشاہتوں کی مسلم ریاستیں، ایران، افغانستان اور پاکستان سمیت چند ممالک نے ہی مذہبی نام کو اپنے ساتھ منسلک کیا ہوا ہے۔

ہمارے آئین میں جب یہ لکھا ہوا ہے کہ ملک کا صدر اور وزیراعظم مسلمان ہوگا۔ ہمارے ملک میں مسلمان کئی مسلکوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں بعض ایک دوسرے کو مسلمان ہی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں پھر غیر مسلموں کو برابر کا شہری ہی تسلیم نہیں کیا جارہا۔اسلئے ضروری ہے کہ ریاست کا مذہب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسکا نام ''جمہوریہ پاکستان'' کرنے کی ضرورت ہے جس میں ہم تمام شہریوں کو برابری کا حق دینے کا عملی قدم اٹھا سکیں۔اس بار کے انتخاب بھی ایک عجیب وغریب انتخابات ہونے جارہے ہیں۔ جہاں پر کالعدم اور دہشت گرد تنظیموں کو بھی انتخابات میں حصہ لینے کی نہ صرف اجازت ملی ہے بلکہ اوروں کے جلسوں پر پتھراؤ کرنے کی اجازت بھی۔ جو بھی حکمرانوں کی مخالفت کررہا ہے اسے ہراساں کیا جارہا ہے اور گرفتار کیا جارہا ہے۔پی ٹی آئی اور پی ایس پی میں شامل ہونے پر زور دیا جارہا ہے، تحریک لبیک اور جیپ گروپ کی سرپرستی کی جارہی ہے۔مخالفین کو نااہل اور قید کیا جارہا ہے۔ جو حقیقی حکمرانوں کے ساتھ ہے اسے ہر طرح کی سہولت اور چھوٹ دی جارہی ہے۔ان تمام حرکات وعوامل سے یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے حقیقی جمہوریت کی خواہش احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔لہٰذا سرمایہ داری کا متبادل ایک امداد باہمی کے آزاد معاشرے میں مضمر ہے۔ جہاں فوج، عدلیہ، اسمبلی، کرنسی، پولیس، ملکیت، جائیداد، عقیدے، خاندان، جیل اور سرحدوں کا خاتمہ ہوکر دنیا ایک ہو جائے گی۔ایک آسمان تلے ایک ہی خاندان ہوگا۔کوئی طبقہ ہوگا اور نہ کوئی ریاست۔کوئی ارب پتی ہوگا اور نہ کوئی گداگر۔

☆.....☆

بانی مزدور تحریک مرزا محمد ابراہیم

اٹھارویں برسی پر خصوصی مضمون

منظور احمد رضی

برصغیر میں ٹریڈ یونین کے بانی معروف ترقی پسند، محنت کشوں کے عظیم محسن اور مشہور کمیونسٹ رہنما مرزا محمد ابراہیم کی 18ویں برسی 11 اگست 2017 کو منائی گئی۔ اگرچہ موت تو سب کو آنی ہے مگر جو عزت اور شہرت مرزا محمد ابراہیم کو نصیب ہوئی ہے وہ شاید ہی کسی مزدور رہنما کو حاصل ہوئی ہو وہ جس طبقے کی نمائندگی کرتے تھے ان کے ساتھ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ مرزا صاحب کے ساتھ ہوا۔ مرزا محمد ابراہیم 1905 میں جہلم کے قریب کالا گجراں میں پیدا ہوئے ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ایک چھوٹے اور بے زمین کسان تھے ان کے بڑے بھائی مرزا اللہ دتہ چغتائی پشاور سے ایک اخبار روشنی نکالتے تھے۔ مرزا محمد ابراہیم نے جوانی میں قدم رکھتے ہی 1921-1920 میں خلافت تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز بطور مالی کیا بعد میں مزدور کی حیثیت سے بھی کام کیا بعد ازاں 1926ء میں وہ برج ورکشاپ جہلم میں بطور معاون بھرتی ہو گئے۔ 1920ء میں محکمہ ریلوے میں مزدور یونین بن چکی تھی۔ 1930ء میں ان کا تبادلہ جہلم ورکشاپ سے مغل پورہ ہاؤس میں ہو گیا جہاں انہوں نے 1931ء میں یونین میں حصہ لینا شروع کر دیا اس وقت ریلوے میں این ڈبلیو آر یونین مضبوط تھی جس کے صدر ایک انگریز جے بی ملر تھے جبکہ جنرل سیکریٹری ایم اے خان تھے مرزا صاحب مغل پورہ کے صدر مقرر ہوئے۔ 1930ء میں برطانیہ میں صنعتی بحران آیا ہوا تھا جس کا اثر ہندوستان کے محنت کشوں پر بھی پڑا یہاں کارخانے بند ہونے لگے ریلوے مزدوروں کی بھی چھانٹیاں ہونے لگیں ان اقدامات کے خلاف مرزا ابراہیم کی قیادت میں مزدوروں نے زبردست مظاہرہ کیا۔ 1917ء میں چونکہ روس میں انقلاب آ گیا تھا جس کا اثر ہندوستان کے محنت کشوں پر بھی ہوا 1935 میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد پڑی جس کے پہلے جنرل سیکریٹری پورن چند جوشی تھے اسی دوران مرزا ابراہیم کا رابطہ ایک طالب علم جے گوپال کے ذریعے کمیونسٹ پارٹی سے ہو گیا اور وہ 1935ء میں باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے لیبر ونگ کے انچارج بن گئے اسی زمانے میں ریلوے میں فیڈریشن کی بنیاد پڑی جس کے مرکزی سینئر نائب صدر مرزا ابراہیم مقرر ہوئے جبکہ صدر روی وی گری منتخب ہوئے جو بعد میں بھارت کے صدر بھی رہے جنرل سیکریٹری ایس اے ڈانگے بنے تقسیم سے ایک سال قبل یکم مئی 1946ء کو ہندوستان بھر میں ریلوے کے مزدوروں نے بڑھتی ہوئی مہنگائی اور چھانٹیوں کے خلاف مکمل ہڑتال کر دی جس کی قیادت مرزا محمد ابراہیم کر رہے تھے انہیں کہا گیا کہ اسسٹنٹ ورکس منیجر حیدر آباد بن جائیں اور ہڑتال سے لاتعلق ہو جائیں مرزا ابراہیم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا لیکن اس کے بدلے میں ایک لاکھ مزدور بیروزگار ہونے سے بچ گئے اور پے کمیشن نے 9 کروڑ روپیہ مزدوروں کی تنخواہوں کی مد میں دیا تقسیم کے فوری بعد مرزا ابراہیم کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے اور وہ پاکستان کے پہلے سیاسی قیدی بنے۔ آزاد پاکستان میں یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی بعد میں وہ 17 مرتبہ جیل گئے۔ چھ مرتبہ لاہور میں نظر بند رہے پاکستان میں جب وہ 1951ء میں جیل میں تھے تو حکومت نے پنجاب اسمبلی کے الیکشن کا اعلان کر دیا مرزا صاحب کو جیل سے کمیونسٹ پارٹی اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی جانب سے امیدوار نامزد کر دیا ان کے مقابلے میں برسر اقتدار پارٹی مسلم لیگ کے امیدوار احمد سعید کرمانی تھے مرزا صاحب یہ الیکشن جیت گئے، اعلان بھی ہو گیا مگر بعد میں دوسرے نمبر پر آنے والے سرکاری امیدوار کو جتوا دیا گیا۔ مرزا ابراہیم کے 2500 ووٹ مسترد کر دیے گئے اور یوں پہلی مرتبہ الیکشن میں دھاندلی کی گئی۔

پاکستان میں پہلی ٹریڈ یونین فیڈریشن یعنی پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے پہلے صدر مرزا ابراہیم مقرر ہوئے جبکہ نائب صدر فیض احمد فیض آفس سیکریٹری ایرک اسپرین، جوائنٹ سکریٹری فضل الٰہی قربان اور سندھ کے صدر سوبھو گیان چندانی مقرر ہوئے چونکہ مرزا ابراہیم کا تعلق کمیونسٹ پارٹی

سے تھا اس لیے وہ سجاد ظہیر کے اچھے دوست تھے ان کے ساتھ برصغیر کی قابل اعتماد اور نامور شخصیات نے کام کیا ٹریڈ یونین اور سیاسی کاموں کی وجہ سے وہ اپنے شہر جہلم اور گاؤں کالا گجراں میں مقیم اپنی بیوی بچوں اور رشتے داروں سے کٹ کر رہ گئے تھے انہوں نے زندگی کے ستر سال لاہور میں گزار دیے ان کے سامنے پاکستان بنا' ان کی ریلوے ورکرز یونین دو مرتبہ سودے کار ایجنٹ (ورکشاپ) منتخب ہوئی مگر وہ اپنے لیے لاہور میں کوئی مستقل مکان یا دفتر بھی نہ بنا سکے وہ ملک میں جاری سیاسی عمل سے بھی پریشان تھے وہ کہتے تھے کہ اب بھی اس ملک کے عوام کو ایک اچھی ترقی پسند پارٹی کی ضرورت ہے یہ کام کمیونسٹ تحریک سے وابستہ لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ آج سامراج اور اس کے حواری جتنے کمزور ہیں اس سے پہلے کبھی اتنے کمزور نہ تھے لیکن عوام میں کوئی مضبوط سیاسی پارٹی نہیں ہے جو ان کو للکار سکے۔ آج سرمایہ داری اور جاگیرداری اپنے عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہو رہی ہے ملک کے غریب عوام کو بھوک' غربت' جہالت بیماری اور بیروزگاری سے نجات دلانے کے لیے حکمرانوں سمیت عالمی سامراج کے پاس عوام کی خوشحالی کا کوئی پروگرام نہیں ہے سرمایہ دارانہ نظام اپنی آخری شکل میں عوام کو بدحالی کی طرف دھکیل رہا یہ ایسے میں ملک کے تمام تر ترقی پسند سیاسی رہنماؤں کارکنوں ملک کے دانشوروں شاعروں ادیبوں اور صحافیوں سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنی ذمے داریاں نبھاتے ہوئے ایک ترقی پسند پارٹی بنا کر جدوجہد تیز کر دیں۔

مرزا محمد ابراہیم ایک عظیم انسان تھے جنہوں نے ہمیشہ رنگ نسل مذہب زبان اور علاقے سے بالاتر ہو کر اس ملک کے مزدوروں کے لیے جدوجہد کی یہ بات بڑی اہم ہے کہ ان کے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک محنت کش نے عالمی شہرت حاصل کی۔ وہ مزدوروں کے بڑے دانشور کہلائے جس کے سامنے بڑے بڑے علماء او دانشور خاموش رہتے تھے انہوں نے اپنے اخلاق اور کردار سے ملک کے محکوم' مظلوم اور محروم انسانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا مرزا صاحب چاہتے تو حکمرانوں سے مراعات حاصل کر سکتے تھے انہیں بار بار اس کی پیش کش بھی کی گئی مگر کوئی بھی حکمران انہیں خرید نہیں سکا حکمرانوں اور انتظامیہ نے مل کر یونین کو کمزور کیا مزدور تحریک کمزور پڑنے لگی تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہو گیا۔ انہی وجوہات نے مرزا ابراہیم کو بیمار کر دیا۔

اس طرح مرزا ابراہیم محنت کشوں کی عالمی تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ 1935ء میں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔ انہوں نے برصغیر کے بڑے بڑے نامور رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں' کام کیا' جیلیں کاٹیں۔ انہوں نے محمد علی جناح' لیاقت علی خان' جواہر لعل نہرو' عبدالغفار خان' جی ایم سید' سجاد ظہیر' علی سردار جعفری' کیفی اعظمی' فیض احمد فیض' حسن ناصر سمیت کئی رہنماؤں کے ساتھ کام کیا۔ تقسیم کے بعد ریلوے ورکرز یونین کی بنیاد رکھی۔ پاکستان کی پہلی مزدور فیڈریشن پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن بنائی اس کے بانی صدر بنے۔ ان کے ساتھ نائب صدر فیض احمد فیض' سی آر اسلم' ایرک اسپرین' عابد حسن منٹو' فضل الٰہی قربان' ڈاکٹر عبدالمالک' سوبھو گیان چندانی بھی اسی فیڈریشن میں شامل رہے بعد میں ایوب خان کے دور میں کمیونسٹ پارٹی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین' پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن' ریلوے ورکرز یونین پر پابندی لگا دی گئی وہ پاکستان کے پہلے سیاسی قیدی بنے۔ شاہی قلعہ میں نظر بند رہے۔ انہوں نے حسن ناصر' حسن عابدی' انیس ہاشمی' محمود الحق عثمانی' ولی خان' دادا امیر حیدر' دادا فیروز دین منصور' فیض احمد فیض' حبیب جالب' عبدالصمد اچکزئی' سردار شوکت علی' ڈاکٹر اعزاز نذیر' طفیل عباس' منہاج برنا' امام علی نازش' میجر اسحاق' افضل بنگش' غلام نبی کلو' چوہدری فتح محمد' محمد اسلم' عبدالرشید باغی' نبی احمد' ایس پی لودھی' مولانا عبدالحمید بھاشانی' میاں افتخار الدین' محمد حسین عطا' احمد ندیم قاسمی' حمید اختر' نثار عثمانی' حیدر بخش جتوئی' مسعود کھدر پوش' ظفر اللہ پوشنی' حسن حمیدی' سوبھو گیان چندانی' احمد الطاف' زین الدین خان لودھی' حسین الدین لودھی' ڈاکٹر شمیم زین الدین' شمیم اشرف ملک' بیگم شمیم اشرف ملک' بیگم ایلس فیض سمیت کئی نامور سیاسی رہنماؤں شاعروں ادیبوں کے ساتھ بھرپور جدوجہد کرتے ہوئے زندگی گزار دی۔

محنت کشوں کا یہ قلندر 11 اگست 1999 کو پاکستان سمیت دنیا بھر کے محنت کشوں کو سوگوار کر گیا آج جبکہ ملک میں افراتفری ہے ایک جمہوری حکومت ختم کر دی گئی قومی اداروں کی نجکاری کا عمل جاری ہے ٹریڈ یونین زوال پذیر ہے آج مرزا ابراہیم زیادہ یاد آ رہے ہیں ان کی سخت اور مشکل زندگی کو سرخ سلام۔☆☆

عوامی ورکرز پارٹی کی ملک بھر میں جاری سرگرمیوں پر ایک نظر

ترتیب وتدوین: عابد شکیل فاروقی

☆.....عوامی ورکرز پارٹی نے 25 جولائی کے انتخابات میں ملک بھر سے تقریباً 22 امیدواران میدان میں اتارے تھے جن میں سے 8 قومی اسمبلی کی نشستوں پر مقابلہ کر رہے تھے جبکہ 14 صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں پر میدان میں تھے، انتخابات کے دن تک یہ تعداد گھٹ کے 19 رہ گئی، آخری موصول شدہ نتائج کے مطابق پارٹی امیدواروں میں سے قومی اسمبلی کے جناب فانوس گجر نے 11789، شاہجہاں عصمت رضا نے 484، ذوالفقار بروہی نے 1418، عمار رشید نے 912، شاہد خان نے 1167، جبکہ صوبائی اسمبلی کے محمد زبیر نے 4586، حسن عسکری نے 469، محمد توفیق نے 87، طالع مند نے 2562، حکیم خان نے 941، عمرزادہ نے 1168، رضا خان نے 289، اور سنگار نوناری نے 924 ووٹ حاصل کئے اس طرح جمع شدہ اعداد شمار کے مطابق عوامی ورکرز پارٹی کے تمام امیدواروں نے مجموعی طور پر پورے ملک سے 29454 ووٹ حاصل کئے۔

☆.....مورخہ 16 جولائی 2018 کو اکوافینا کے مزدوروں کو بیروزگار کرنے اور کورٹ کے فیصلے پر عملدرآمد نہ کرنے پر IRA کے صدر اور عوامی ورکرز پارٹی کے سینئر نائب صدر یوسف مستی خان کی قیادت میں دنبہ گوٹھ سے اکوافینا پلانٹ کے مرکزی دروازے تک ایک ریلی نکالی گئی، ریلی کے اختتام پر اکوافینا کے پلانٹ پر دھرنا دیا گیا، یہ دھرنا پاکستان بیوریج لمیٹڈ اکوافینا محنت کش یونین کے مزدوروں نے اینڈ ٹیکینس رائیٹس الائینس اور عوامی ورکرز پارٹی کے دوستوں کے ساتھ مل کر دیا، اس موقع پر زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں نے مظاہرین سے اپنی یکجہتی کا اظہار کیا۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی کے صدر کامریڈ فانوس گجر نے، پارٹی کے ان امیدواروں کو مبارک باد دی ہے جنہوں گزشتہ انتخابات میں حکمراں اشرافیہ کی سیاسی جماعتوں کے خلاف اپنے انتہائی کم وسائل کے باوجود بہادری سے مقابلہ کیا، بعد از انتخابات پارٹی کی مرکزی لیڈرشپ کے ایک اجلاس میں، جو کہ 3 اگست کو لاہور میں منعقد ہوا، شرکت کے بعد اپنے ایک بیان میں انہوں نے کہا پارٹی اب ملک کے ہر ضلع میں اپنی موجودگی کو یقینی بنانے کے لئے اپنی رکنیت سازی مہم میں تیزی لانی ہوگی جس کے لئے اب ہمیں ملک کے کونے کونے سے نوجوانوں، خواتین اور محنت کش عوام کو مخاطب کرنا ہوگا انکے پاس جانا ہوگا انہیں دعوت دینی ہوگی کہ وہ پارٹی کے رکن بنیں تاکہ ملک میں ایک حقیقی ترقی پسند متبادل سیاسی قیادت فراہم ہو سکے۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی رہنماؤں، کامریڈ فانوس گجر صدر اور کامریڈ اختر حسین جنرل سیکریٹری عوامی ورکرز پارٹی نے، اپنے الگ الگ بیانات میں، مورخہ 10 اگست 2018 کو پارٹی کے حیدرآباد میں واقع دفتر پر چھاپہ اور وہاں موجود کارکنوں کو ہراساں کرنے کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے، اور اسے دہشت گردی کی ایک کاروائی قرار دیا، انہوں نے کہا کہ یہ ان قوتوں کی کاروائی ہوسکتی ہے جو پارٹی کی انقلابی جدوجہد اور تیزی سے بڑھتی ہوئی عوامی مقبولیت، اور حقیقی معنوں میں، متبادل قوت کے طور پر ابھرنے سے خوفزدہ ہیں، بیان میں، سپریم کورٹ اور سندھ ہائی

کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس واقعہ کا نوٹس لیں اور ذمہ داروں کو قرار واقعی سزا دیں،عوامی ورکرز پارٹی شمالی انگلینڈ اور لندن یونٹس کے رہنماؤں پرویز فتح ، ڈاکٹر ہاشمی اور دیگر رہنماؤں نے بھی اس واقعہ کی مذمت کی اور خبردار کیا کہ اسٹبلیشمنٹ اور انکے پالتو عوام دشمن عناصر اس قسم کی حرکتوں سے باز رہیں۔

☆.....صوبے سندھ کے دیگر اضلاع اور شہروں کی طرح کراچی میں بھی مورخہ 11 اگست 2018 کو، سندھ بھر میں نہری پانی کی شدید قلت اور سیاسی کارکنوں کی بلا جواز گرفتاریوں کے خلاف ،سندھ کی دیگر پارٹیوں کے ساتھ ایک احتجاجی مظاہرہ کیا گیا، جس کی قیادت جئے سندھ محاز، کے عبدل خالق جونیجو،عوامی جمہوری پارٹی کے امان اللہ شیخ ، اور عوامی ورکرز پارٹی کے شفیع شیخ نے کی ، مظاہرین نے کہا کہ نہری پانی کی اس قلت کے باعث ،سندھ کے کھیتوں میں کھڑی فصلیں خشک ہورہی ہیں۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی کے قائدین کامریڈ اختر حسین ، یوسف مستی خان کی قیادت میں پارٹی کے ایک وفد نے مورخہ 19 اگست 2018 کو کراچی کے مضافات ''کاٹھور'' میں علاقے کے نوجوان سیاسی کارکنوں سے ملاقات کی جسمیں کاٹھور کے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد نے عوامی ورکرز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کیا جس کے ساتھ ہی علاقے میں پارٹی کا یونٹ قائم کرکے، کامریڈ حفیظ بلوچ کو یونٹ کا کنوینر مقرر کیا جنہوں علاقے میں پارٹی کی ممبر سازی مہم کا باقاعدہ آغاز کیا، کامریڈ حفیظ بلوچ نے کاٹھور اور گڈاپ کے دوستوں سے گزارش کی کہ نظریاتی سیاست کے لئے اور ایک بہتر مستقبل کے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں عوامی ورکرز پارٹی میں شمولیت اختیار کریں۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی رہنماء پارٹی کے سب سے اعلی ادارے کے رکن کامریڈ بابا جان ایک اور کیس میں باعزت بری کردیئے گئے ، کامریڈ بابا جان مورخہ 27 اگست 2018 کو ہنزہ سیشن کورٹ میں 2012 میں درج ایک جھوٹے مقدمے کی پیشی کے لئے تشریف لائے تھے ۔ 2012 میں جب کامریڈ بابا جان ضمانت پر رہا ہو گئے تھے اور گردوں کے علاج کے سلسلے میں کراچی چلے گئے تھے اس دوران ہنزہ میں ان پر ''نصیر آباد ماربل یشو'' کے نام پر ایک جھوٹا مقدمہ دائر کیا گیا تھا، جس میں کامریڈ کو آج باعزت رہائی ملی ۔کامریڈ ابھی بھی ءمزید دو جھوٹے مقدمات کی سزا بھگت رہے ہیں اور گاہکوچ جیل میں ہیں۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی کراچی کا ماہانہ اجلاس مورخہ 2 ستمبر 2018 کو کراچی میں زیر صدارت کامریڈ عثمان بلوچ صدر عوامی ورکرز پارٹی کراچی منعقد ہوا، جس میں کراچی پارٹی کی ایگزیکٹیو کمیٹی اور جنرل کمیٹی کے اراکین کے علاوہ کامریڈ یوسف مستی خان سینئر نائب صدر عوامی ورکرز پارٹی نے خصوصی طور پر شرکت کی ،اجلاس میں پارٹی کے سیکریٹری کامریڈ شفیع شیخ نے کراچی میں پارٹی کی گزشتہ سرگرمیوں اور آئندہ کے لائحہ عمل سے متعلق شرکاء کو آگاہ کیا، اجلاس میں شرکاء کو آگاہ کیا گیا کہ پچھلے عرصے کے دوران، کراچی اور اس کے مضافات میں رہنے والے چند دوستوں کی پارٹی میں شامل ہونے کے نتیجے میں کراچی میں چند نئے یونٹس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، اس کے علاوہ اجلاس میں پارٹی کی عام آبادی سے جڑے مسائل کی بنیادوں پر عوام میں جانے کی بابت غور کیا گیا اور اس حوالے کے ساتھ ساتھ چند دیگر امور پر بھی فیصلے کئے گئے ،جسمیں نمایاں ، پارٹی میں نئے شامل ہونے والے پارٹی اراکین کے اعزاز میں استقبالئے کا انعقاد، پارٹی کی لئے صدر میں مختص نئے پارٹی دفتر اور اس سے ملحقہ ورکرز ہال کے انتظام وانصرام کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل۔

☆.....جموں وکشمیر عوامی ورکرز پارٹی کی طرف سے مورخہ 16 ستمبر 2018 کو نیلم جہلم ہائڈرل پاور پروجیکٹ کے نتیجے میں مظفر آباد میں پیدا ہونے والے پانی کے مسئلے اور ماحولیاتی بحران کے خلاف اسلام آباد میں احتجاجی مظاہرہ کیا گیا مظاہرے میں پارٹی نے پاکستانی کنٹرول کشمیر میں ماحولیات کے تحفظ اور مقامی وسائل پر مقامی عوام کے اختیار کے لئے ''آزاد کشمیر کو آزاد کرو'' کا نعرہ دیا پارٹی نے Climate Justice Movement کو آگے بڑھانے اعادہ کیا۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی راولپنڈی اسلام آباد کے زیر اہتمام، مورخہ 14 ستمبر 2018 کو ہر دلعزیز استاد، مصنف، شاعر، اور مارکسی دانشور مرحوم کامریڈ پروفیسر یوسف حسن کی یاد ایک تعزیتی ریفرینس کا انعقاد کیا گیا، جسمیں پارٹی کے رہنماؤں، کارکنوں اور مرحوم کامریڈ کے چاہنے والے ادب پرور شخصیات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

پارٹی میں شامل ہونے والے نئے ساتھیوں کے اعزاز میں استقبالیہ

مورخہ 25 جولائی کے انتخابات کے بعد عوامی ورکرز پارٹی کے ایک اعلی سطح کے اجلاس، منعقدہ لاہور، میں فیصلہ کیا گیا کہ ملک گیر سطح پر پارٹی کی رکنیت سازی میں تیزی لائی جائے اور کوشش کی جائے کہ ملک کے کونے کونے سے عوام الناس کو، سماج میں حقیقی تبدیلی لانے کی دعویدار پارٹی اور اس کے پروگرام سے روشناس کرایا جائے، پارٹی کی ہدایات اور اس فیصلے کی روشنی میں، کراچی میں نئی رکنیت سازی کے لئے مختلف سطحوں پر کوششیں شروع کر دی گئیں تھیں جس میں انفرادی سطح پر سیاسی دوستوں سے ملاقاتیں کی گئیں، انکو پارٹی کے منشور سے آگاہ کیا جاتا رہا، مختلف علاقوں میں عوامی اور شہری مسائل کے حوالے سے پارٹی کی سرگرمیوں میں بھی تیزی لائی گئی، جس کے نتیجے کے طور پر، ایک ڈیڑھ مہینے کے مختصر عرصے میں پارٹی کو کراچی میں قابل زکر حد تک کامیابیاں نصیب ہوئیں اور کراچی کے مختلف علاقوں، فرنٹئیر کالونی، کاٹھور میں سرگرم سیاسی شخصیات، کے علاوہ پاک کالونی اور دیگر علاقوں میں کامریڈ حسن ایلیا اور این ایس ایف کے طالبعلم رہنماء کامریڈ خرم علی، کی قیادت میں سرگرم ایک مضبوط سیاسی گروپ کو پارٹی کے قریب لانے میں کامیابیاں حاصل ہوئیں، پارٹی کی رکنیت سازی کی اس تمام جدوجہد میں، پارٹی کے سینئر نائب صدر کامریڈ یوسف مستی خان، سیکریٹری جنرل کامریڈ اختر حسین، مرکزی آرگنائزنگ سیکریٹری کامریڈ جاوید اختر، کراچی پارٹی کے صدر کامریڈ عثمان بلوچ، کراچی پارٹی کے سیکریٹری شفیع شیخ، کراچی پارٹی کے سابق صدر کامریڈ شاہ نور، اور پارٹی کے دیگر ساتھیوں کی انتھک محنت کا دخل ہے جنہوں نے اپنی اپنی سطح پر دن رات ان تمام دوستوں سے ملاقاتیں کر کے انکو پارٹی پروگرام اور مختلف اشوز پر پارٹی کی پالیسیوں سے آگاہ کیا، سیاسی اور نظریاتی حوالے سے انکے مختلف تحفظات پر ان ساتھیوں کو مطمئن کیا جس کے بعد یہ تمام ساتھی پارٹی میں شمولیت پر آمادہ ہوئے، ان تمام مراحل کی کامیاب تکمیل کے بعد کراچی پارٹی نے ان تمام ساتھیوں کو کراچی پارٹی میں خوش آمدید کہنے کے لئے ایک استقبالئے کے انعقاد کا پروگرام بنایا، جو کہ مورخہ 9 ستمبر 2018 کو کراچی پارٹی آفس کے ورکرز ہال میں منعقد ہوا۔ استقبالئے کی صدارت کراچی پارٹی کے صدر کامریڈ عثمان بلوچ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض کراچی پارٹی کے سیکریٹری کامریڈ شفیع شیخ نے کی۔ استقبالئے میں پارٹی کے سینئر نائب صدر کامریڈ یوسف مستی خان، سیکریٹری جنرل کامریڈ اختر حسین، مرکزی آرگنائزنگ سیکریٹری کامریڈ جاوید اختر نے نئے ساتھیوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے بنفس نفیس شرکت کی، علاوہ ازیں کراچی میں پارٹی کے اراکین کی کثیر

تعداد نے نئے دوستوں کوخوش آمدید کہنے کے لئے بھرپور طریقے سے شرکت کی ، جبکہ پارٹی کے نئے اراکین کی ایک کثیر تعداد نے اپنے اپنے قائدین ، کامریڈحسن ایلیا ، کامریڈخرم علی، کاٹھور یونٹ کے کامریڈ حفیظ بلوچ، اورفرنٹئر کالونی کے ، ساتھی شوکت علی خان کے ہمراہ اس استقبالیئے میں شرکت کی ، اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل زکراوراہمیت کا حامل امر یہ تھا کہ پارٹی میں نئے شامل ہونے والے ساتھیوں کی ایک کثیر تعدادنوجوان سیاسی کارکنوں پر مشتمل تھی ، جنکی عمریں بیس سال سےلیکرتیس سال کے درمیان تھیں،ایک بنیادی سماجی تبدیلی کی دعوے دارانقلابی جماعت میں نوجوانوں کی اتنی بڑی تعداد کی شمولیت کے مظاہرے پر پارٹی کے تمام ضلعی ، ومرکزی ذمہ داروں نے انتہائی خوشگوار ردعمل کا اظہار کیا، اوراس عمل کومستقبل میں پارٹی کیلئے ایک خوشکن تبدیلی اور ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے سے تعبیر کیا۔ پروگرام کے آغاز میں کراچی پارٹی کے سیکریٹری کامریڈشفیع شیخ نے نئے آنے والے ساتھیوں کوخوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ مجھے اپنے ان ساتھیوں کو پارٹی کے نئے ساتھی کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے میرے نزدیک یہ تمام دوست سیاسی میدان میں نئے نہیں ہیں سب کی اپنی اپنی سطح پر کافی سیاسی جدوجہد ہے، اس لئے یہ میرے ہی ساتھی ہیں، کیا ہوا کہ تنظیمی بنیادوں پر ہم الگ الگ پلیٹ فارم سے جدوجہد کررہے تھے مگر منزل سب کی ایک ہی تھی ،آدرش ،فکر،جستجو،سب کی سانجھی تھی سب ایک ہی قافلے کے شہسوار تھے ، استقبالئے سے ، مرکزی قائدین ، کامریڈ یوسف مستی خان، اختر حسین، جاوید اختر، نے اپنی اپنی گفتگو میں دیگرموضاعات پر بات کرنے کےعلاوہ،عوامی ورکرز پارٹی سے وابستگی اختیار کرنے والوں تمام دوستوں کوخوش آمدید کہااوراامید کا اظہار کیا کہ پارٹی میں توانائی اور ہمت سے بھرپور نئےخون کی شمولیت سے پارٹی کا کام حقیقی معنوں میں تیزی سے آگے بڑھے گا ، اور آبادی کے ایک بہت بڑے حصے تک پارٹی کی آواز پہنچانے میں مدومعاون ثابت ہوگا، استقبالئے سے پارٹی کے مرکزی رہنماؤں کے علاوہ کاٹھور یونٹ کے کامریڈحفیظ بلوچ ، کامریڈحسن ایلیا، کامریڈخرم علی، کامریڈ فاطمہ، نے بھی خطاب کیا، جبکہ پارٹی کی نوجوان ساتھی کامریڈزیبانے اس موقع پرایک انقلابی نظم پیش کرکے شرکاء سے داد سمیٹی۔سب سے آخر میں عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے صدر کامریڈعثمان بلوچ نے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے پہلے تو پارٹی شامل ہونے والے تمام دوستوں کوخوش آمدید کہا، اور ساتھ ہی تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے تمام مہمانوں کوچائے پینے کی دعوت دی۔

☆☆☆

عوامی جمہوریت کے قارئین سے درخواست

ہر بار کی طرح اپنے قارئین سے ایک بار پھر سے درخواست ہے کہ: اپنے اپنے اضلاع ،شہر،صوبے میں جاری پارٹی کی سرگرمیوں سے عوامی جمہوریت کومطلع کریں تاکہ ہم اس پرچے کے زریعے ملک بھر کے دیگرسیاسی کارکنوں اورتمام دنیا میں رہائیش پزیر پاکستانیوں کوان سرگرمیوں سے آگاہ کرسکیں۔آپ پارٹی کی سرگرمیوں کے حوالے سے تصاویر بھی اس پرچے میں اشاعت کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ پرچے کے مالی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں آپ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے،آپ سے درخواست ہے کہ براہ مہربانی اس سلسلے میں پرچے کے واجبات وقت پر ادا کریں۔

عوامی جمہوریت کوملکی سیاست ومعیشت،سماجیات،شہری علاقائی پیشہ وارانہ مسائل اور عالمی سیاسی موضوعات پرآپ کی تحریروں کا انتظار رہے گا

سندھ میں زرعی پانی کے مسئلے پر عوامی ورکرز پارٹی نوڈیرو کا مظاہرہ

اے ڈبلیو پی کراچی کا ماہانہ اجلاس زیر صدارت کامریڈ عثمان بلوچ

اے ڈبلیو پی کراچی کے زیر اہتمام کارکنوں کے اعزاز میں عید ملن پارٹی کا انعقاد

اے ڈبلیو پی کے قافلے میں شامل ہونے والے نئے دوستوں کے اعزاز میں کراچی میں دیئے جانے والا استقبالیہ

معروف انقلابی و مزاحمتی شاعری کے درخشاں ستارے کامریڈ خالد علیگ کی، اگست میں، گیارہویں برسی پر
ان کو سرخ سلام پیش کرتے ہیں اور اس موقع پر ان کی شاعری کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

خالد علیگ

اک عمر سے میں خاکِ شفا بانٹ رہا ہوں
تو خاک بسر ہے تو اِدھر کیوں نہیں آتا
منہ ڈھانپتے ہوئے آتا ہے مے خانے میں واعظ
آتا ہے تو بے خوف و خطر کیوں نہیں آتا
اقساط میں مرتی ہی چلی جاتی ہے یہ قوم
خالدؔ اِسے جینے کا ہنر کیوں نہیں آتا

اپنی حفاظت کرنا آپ، اس میں ہرگز عار نہ کرنا
گھر پہ قبضہ کر بیٹھے گا لوگو چوکیدار نہ رکھنا

قاتل سے انتقام تو لیکر رہیں گے ہم
پر اپنے انتقام کی صورت کچھ اور ہے
اب بت گروں کے سر بھی گریں گے بتوں کے ساتھ
اب بت کدے میں کار رسالت کچھ اور ہے

اے قوم دانا اے قوم دینا، اس درجہ گرمی اس درجہ سردی
تیرا مقدر، میرا مقدر، یا غنڈہ گردی یا فوج گردی

میں ہوں گرہ کشا تو گرہ کھولتا ہوں میں
میزان خیر و شر میں تمہیں تولتا ہوں میں
یہ بھی میرا قصور، کہ تم ہو دروغ گو
یہ بھی میری خطا ہے کہ سچ بولتا ہوں میں